[مختصرافسانے]

سیّدماجدشاہ

زمانہ سمٹ رہا ہے اور زمین پر کل
اسبابِ جہاں بھی مائل بہ اختصار ہے۔ حیاتیات کی
تعلیم میں Micro Biology نے ایک خاص اہمیت
اختیار کر لی ہے۔ بڑی بڑی مشینیں کھلونا بن چکی
ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے کائنات کی ابتداء کو
Big Bang اور انتہا کو Big Crunch کی شکل
میں دیکھ رہے ہیں۔

اس تناظر میں فکشن لکھنے والوں کا اختصار
کی طرف آنا ایک فطری عمل ہے۔ گذشتہ چند برسوں
میں عالمی ادب میں اس سلسلے میں بعض حیران کُن
تخلیقات سامنے آئی ہیں لیکن اُردو ادب میں یہ
رجحان تازہ ہے اور اپنے امکانات کی جستجو میں ہے۔
Micro Fiction کے مذکورہ امکانات کی تلاشیوں
کے قافلے میں سید ماجد شاہ ایک بھرپور اعتماد کے
ساتھ داخل ہوئے ہیں۔ ان کے موضوعات کا دائرہ
وسیع ہے اور فکری و فنی برتاؤ کے لحاظ سے تنوع کا
حامل بھی ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کو محدود ہیئتی ساخت
میں ڈھالنے کے ہنر سے آگاہ ہیں اور کہانی کے اندر
تاثریت پیدا کرنے پر حیرت افزا دسترس رکھتے
ہیں۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی
شعبہ اردو
جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

سیّد ماجد شاہ

ماں۔۔۔ر۔۔۔کو خوب لمبا کھینچ کر کہتی،

رررر۔۔۔روشنی، تو۔۔۔ر۔۔۔کا ارتعاش،

میرے اندھیروں میں شرر فشانی کرنے لگتا۔

اقتباس افسانہ

''نابینا''
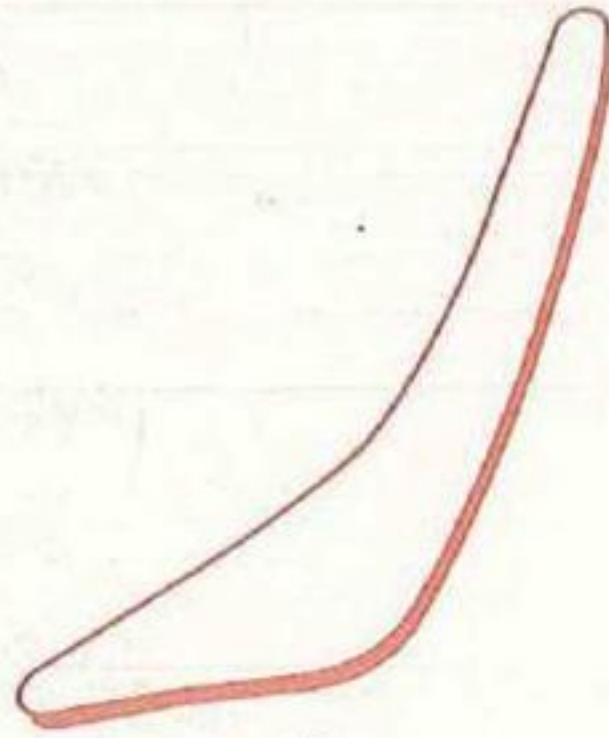
[مختصر افسانے]

سیّد ماجد شاہ

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

اشاعت	:	2018ء
کتاب	:	رے (مختصر افسانے)
افسانہ نگار	:	سید ماجد شاہ
ناشر	:	محمد عابد
قیمت	:	300 روپے
مطبع	:	بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

Rey

by

Syed Majid Shah

Edition : 2018

اهتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
+92-41-2615359- 2643841, Cell:0300-6668284
email: misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر صابریہ سینٹر، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

احمد سلمان

کے نام

جو صرف شاعری کو عبادت سمجھتا ہے۔

میں سپاس گزار ہوں۔

عامر سہیل، ڈاکٹر عاکف اللہ خان، کرنل حمید اللہ خان جدون، میجر بشیر اور قبلہ جوہر علی خان کا جو افسانوں کو سراہتے رہے اور میں ان کی محبّت کے میٹھے سائے تلے بیٹھ کر لکھتا چلا گیا۔

مفیدہ ماجد، ژند ماجد

اور خصوصاً

شعبان جھلن شعبان اور منیر عباس سپرا کا بہت ممنون ہوں جو مسلسل، ان مختصر افسانوں کو کتابی صورت میں لانے کے لیے میری ہمت بندھاتے رہے۔

فہرست

ماجد کے مختصر افسانے

ناموں کی بھرمار ہے۔ ذرا سنیے۔۔۔

پوپ کہانی، پوپی، پاپولر فکشن،، فلیش فکشن، مائیکروف۔ مائیکروسٹوری، نینو فکشن، کہانچیاں، افسانچہ، ون سگریٹ سٹوری، سموک لانگ، پھر لفظوں کی کہانیاں یعنی اس کے بعد تو اِن فینی ہے بھائی۔۔۔ تیس لفظ، سو لفظ، نہ گنتی ختم ہو نہ کہانی کی اصناف۔۔۔ اس سے تو اربوں کھربوں بابا آدم اپنی اپنی اماں حوا (سوری ان کے لیے تو صرف حوا) لیے زمین پر ایلین کی طرح اُترتے رہیں گے۔ اور اوّلیت کا سہرا سجاتے رہیں گے۔

میں نے ۱۹۹۵ میں فارغ اوقات میں بیٹھ کر کچھ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھیں جس بھی رسالے کو بھیجیں تو اصرار ہوا کہ انھیں تھوڑا بڑھاؤ، کھینچ کھانچ کر لاؤ۔۔۔ اب میں کیسے۔ رومال کو عبایا بناؤں؟؟؟؟۔۔۔ میرے مختصر ترین افسانے رسالہ ''شعر و سخن'' مانسہرہ اور ''تجدیدِ نو'' لاہور میں غالباً ۲۰۰۸ سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔۔۔ اس زمانے میں مختصر کہانی رسالوں میں چھپوانا بھی مسئلہ ہوتا تھا۔ بلکہ آج کے دور کی بھی ایک بات سنتے جائیے۔ ڈاکٹر انوار صاحب کے رسالے ''پیلوں'' کے لیے میں نے ایک مختصر افسانہ بھیجا ان کی میل آئی جس کا مفہوم تھا کہ اسے کھینچ تان کر طویل کریں۔۔۔

میں اپنی کہانی لے کر بیٹھ گئی۔۔۔ مجھے تو ماجد کے افسانوی مجموعے ''ر'' کا

دیباچہ لکھنا ہے۔۔۔جی ''افسانے'' جنھیں وہ مختصر ترین افسانے کے نام سے فیس بک پر بھی شیئر کرتے رہے۔

میرے اور ماجد کے درمیان یہ اصناف زیرِ بحث آتی رہیں۔ ہم افسانے کے متعلق کچھ باتوں پر متفق ہیں بلکہ ہم دونوں کی رائے یہی ہے کہ کہانی یا افسانے کو صرف اختصار کی وجہ سے کوئی بھی ایسا نام دینا جو ''اسم تصغیر'' ہو، موزوں نہیں یہ کوئی کم تر یا گھٹیا صنف نہیں ہے۔ ماجد اکثر کہتے ہیں کہ جب ہزار بارہ سو صفحات کا ناول بھی ناول ہے اور سو صفحوں کا بھی، جب وہ ناولچہ نہیں ہوا۔ غزل سو شعروں کی بھی غزل۔ اور دو تین شعروں والی کبھی غزلچہ نہیں ہوئی یہی حالت نظم اور دیگر اصناف کی بھی ہے۔ سو افسانچہ، کہانچی اور پوپی سے تو ہم تائب ہوئے۔ اب رہ گئی بات وقت کے حساب سے افسانے کو باقی اصناف سے الگ کرنا۔۔۔ ہم سادہ لوح تو اب بھی افسانے کی تعریف یہ بتاتے ہیں کہ وہ کہانی جو آدھے گھنٹے سے ایک گھنٹے میں پڑھی جائے۔۔۔ حیرت ہے ایسی تعریف جس عرشِ معلیٰ سے بھی آئی۔۔۔ ہم نے یہ سوال کرنا گوارا نہ کیا کہ کیوں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ کچھ لوگ گھنٹے میں صفحوں کے صفحے پڑھ لیتے ہیں۔۔۔ کوئی بے چارہ دو صفحے پڑھ کر ہانپ جاتا ہے۔ ہمارے افسانہ نگار اب کیا سٹاپ واچ رکھ کر لکھیں؟۔۔۔ یا تقریر کی طرح پہلی گھنٹی تیس منٹ پر پھر دوسری ایک گھنٹے میں بجائی جائے کہ اس سے پہلے افسانہ ختم ہو جانا چاہیے ورنہ۔۔۔ ورنہ ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہوا تو کمپنی یہ بتانے کی ذمہ دار نہ ہوگی کہ آپ نے کیا پڑھا۔۔۔؟ ناول کے بارے میں تو ہم نے سوچا نہیں کہ وہ کتنے گھنٹوں کی مشقت کی مار ہے۔۔۔ اور افسانہ گھنٹے بھر کی۔۔۔ یہ ڈیڑھ گھنٹے والی مخلوق کا نام تو ہم بھی نہیں جانتے۔

ماجد نے جب ہندکو افسانے خود پڑھ کر فیس بک پر شیئر کرنے شروع کیے تو ایک دن ازراہِ تفنن کہنے لگے کہ میرے کچھ افسانے آٹھ منٹ میں ختم ہوتے ہیں کچھ سات اور کچھ دس منٹ میں کیوں نہ یہ نئی صنف ایجاد کریں۔ آٹھ منٹ کا افسانہ۔۔۔ ''آٹھ منٹیا''

ساٹ والا ''ساٹ سنٹیا'' اس طرح ہمارا نام بھی عظیم مسلمان سائنسدانوں میں آجائے۔۔۔
میں نے جواباً کہا میرے تو بعض ڈھائی گھڑی میں ختم ہو جاتے ہیں۔ سوان زہریلوں کا نام
تو ''ڈھائی گھڑیا''۔۔۔

آزادی کے قائل ادیبوں کی کہانی یا افسانہ لفظوں کی قید میں کیوں ہو؟ اگر کہانی
۹۹ لفظوں میں پوری ہوگئی ہے تو یہ آخری سوواں لفظ جبراً اس میں کیوں شامل کیا جائے؟۔۔۔
اور اگر کہانی ایک سو ایکویں لفظ کا تقاضا کر رہی ہے تو ہم اسے لنڈورا کیوں چھوڑیں۔۔۔؟

ہمارے خیال میں اگر آپ کہانی کو افسانہ سے الگ سمجھتے ہیں تو مختصر کہانی لکھ کر
اسے کہانی ہی کہیں۔ اگر آپ نے افسانہ لکھا ہے تو اسے افسانہ ہی کہیں ہاں اگر تکنیکی اعتبار
سے ناول، داستان، افسانے اور ڈرامے کی طرح اس کی تکنیک الگ ہے تو اسے اس تکنیک
کے اعتبار سے ضرور نام دیں کیونکہ ادب ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا فیصلہ کوئی لابی، کوئی
نظریہ یا گروپ نہیں کر سکتا یہ صدیوں کا کھیل ہے۔ خود وقت چیزوں کو قبول یا رد کرتا ہے۔

میری اس طویل تمہید کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ ان افسانوں کو جو بھی نام دیں۔
بس پڑھیں ضرور۔ یہ خاصے کی چیز ہیں۔

سیّدہ مفیدہ ماجد

لرتوشیا

''لرتوشیا'' کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ یہ تجھے متوجہ کرنے کے لیے لکھا ہے۔۔۔
اب تو کہانی سن۔۔۔

اب کہ جو بہار آئی تو ایک پھول بھی نہیں کھل رہا تھا۔ مالی بھر بھر مشکیں ڈالتا رہا۔
جب موسم عین وسط میں پہنچا تو بارشیں بھی ہونے لگیں۔

۔۔۔ بہار کا موسم تیزی سے اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کھاد پر کھاد ڈالی گئی۔
آسمان کو التجائی نظروں سے گھورا گیا۔ حالاں کہ اب تک فضا کے فلٹر میں پھنسا سارا کچرا زمیں
پر پڑا تھا، لیکن وہ کچرا کسی دو نمبر کریم کی طرح زمین کے مساموں میں جذب نہیں ہو رہا تھا۔
زمین کی کھردری جلد ملائم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ خود سر کونپلیں پھوٹتی ضرور تھیں لیکن بند مٹھی
کھول نہ پاتی تھیں کہ جھڑ جاتی تھیں۔۔۔ بالآخر کوئی ایک آدھ مسام ڈھیلا پڑا، پہلی کونپل
نے مٹھی کھولی۔

''لرتوشیا'' اسی حنائی ہتھیلی پر تحریر ہے۔۔۔ شاید متوجہ کرنے کے لیے۔۔۔ اک وا
ہوئی ہتھیلی پر۔۔۔ جو ہاتھ تھامنے کی دعوت لیے ہوئے ہے۔۔۔ مگر افسوس آج بہار کا آخری
دن ہے۔۔۔

ہائے زمانے!!

برائی عیاں ہو کر رہتی ہے۔ یاد رکھنا برائی کبھی چھپ نہیں سکتی۔ یہ دروازہ بند کر کے سمجھتے ہیں کہ سب کچھ چھپا لیں گے۔ دیکھ لینا یہ آہن و چوب کا مضبوط دروازہ جو آج ہماری ہمت سے بڑھ کر مقفل کر دیا گیا ہے۔ آنے والا زمانہ خود اس غلاظت کو آشکار کر کے رہے گا۔ دیکھنا کل یہ مضبوط در نرم و نازک دیمک کھول دے گی۔ میری بات پتھر پر لکیر ہے ہر بدی عیاں ہو کر رہے گی۔ لکھ لو۔۔۔ لکھ لو

۔۔۔۔۔صدیاں گزریں۔۔۔۔۔

افسوس! نوشتۂ دیوار حرف بہ حرف درست ثابت نہ ہو سکا۔ ہاں! زنگ آلود لوہا بھربھرا ضرور ہوا، مضبوط لکڑی کھوکھلی ہو کر کاغذ پر بنی تصویر ثابت ہوئی۔۔۔ مگر اتنے عرصے میں برائی قبول صورتی کے پیراہن سے ہوتی روا کی دیوار پھلانگتی عین فرض ہو چکی تھی۔۔۔ زبان کب کی بدل چکی تھی لیکن پھر بھی ماہرین نے نوشتۂ دیوار پڑھ لیا تھا۔

وقت کی دیمک نے لاشوں کو بانی کی حیثیت سے بابائے انقلاب اور مادر انقلاب کا درجہ دے دیا تھا۔
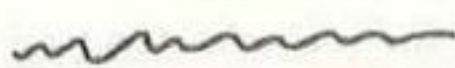
یہ شارع عام نہیں ہے

وہ بہت موڈی تھی۔ اس کی ہر بات نرالی تھی۔ دھندا تو جسم فروشی تھا، لیکن اسے اپنے دھندے کے اس نام سے بہت چڑ تھی۔ اس کے مطابق وہ جسم نہیں اپنا خوش گوار وقت بیچتی تھی۔

کہا نا! وہ بہت موڈی تھی۔ جب اس کا موڈ نہ ہوتا تو وہ تختی آویزاں کر دیتی کہ۔۔۔

بڑا دن

''بڑا دن!! کیا بہت بڑی منافقت کا دن ہوتا ہے؟؟ تین سو چونسٹھ چھوٹے دنوں کا دکھ میں ایک دن میں کیسے بھلا سکتی ہوں؟ میں نے نہیں ملنا تم سے۔۔۔ میٹھی عید کتنے دن ہمارے منہ میٹھے رکھ سکے گی۔ میں مصنوعی مسکراہٹ سے ہونٹوں، گال اور ٹھوڑی کے مسلز زیادہ دیر اکڑا کر نہیں رکھ سکتی۔

۔۔۔اگر پھر بھی تمھاری ضد یہی ہے تو میرے ڈمپل میں ایلفی بھر دو اور گال سہلاتے رہو۔ جب آنسو ایلفی دھو ڈالیں تو تم چلے جانا۔''

تھکا دینے والی صبح

کبھی میرے پاس کتنا وقت ہوتا تھا کہ لمحوں کی ریزگاری سے میری جیبیں بھری رہتی تھیں۔ میں جان بوجھ کر دوستوں کے سامنے اچھل اچھل کر چلتا تھا تاکہ جیب چھنکیں۔ میرے اچھلنے کے انداز میں ریزگاری کی دھنیں بنتی تھیں۔ کبھی چھنن چھن چھنن تو کبھی چھن چھنن چھن۔ میں سارا دن ایک ایک سکہ اچھال کر کھیل خریدتا تھا۔ کانچے اور ڈبیاں اور گلی ڈنڈا کیا کیا میرے بینک بیلنس میں نہیں تھا۔

ایک دن اچانک میری جیب میں وہ سکے آگئے جو بھاری بھر کم تھے۔ جن سے میں خریدنے کی صفت سے آگاہ ہوا اور وقت کے سکے کھوٹے سمجھ کر میں نے کہیں دور پھینک دیے۔

وہ دن اور آج کا دن سورج میرا غلام ہو گیا ہے۔ وہ میرے گھر جھاڑو دینے آتا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن میں سنہری کرنوں والی جاروب کی زد میں ہوں۔ روزانہ ایک ہی ٹھوکر مجھے میرے خوابوں سمیت بازار میں پھینک آتی ہے۔

چاند پر پہلا قدم

گویا وہ پھول کے ساتھ ہی شاخ سے اگنا چاہتا تھا۔ وہ ٹہنی سے کونپل اگنے کی رگڑ کی سنسناہٹ سننا چاہتا تھا۔ وہ کونپل سے غلاف سرکنے کی صدا کو کوئی نام دینا چاہتا تھا۔ وہ پاگل شاخ سے الگ ہوتی برگِ گل کی مہک کا پہلا ریزہ چکھنا چاہتا تھا۔

وہ تو آدم سے جلتا تھا جس نے کرہ ارض پر پہلا قدم زمین سے مس کیا تھا۔ اس تک پہنچتے پہنچتے کھربوں قدم دھرتی کو آلودہ کر چکے تھے۔۔۔ آخر اس کی باری اتنے عرصے بعد کیوں آئی تھی۔

حوا کی پہلی سرگوشی، پھول میں مہک بننے کا پہلا ثانیہ، شاخ سے پھول اُگنے کی پہلی آہٹ۔۔۔ ہر منظر کی پہلی ''م'' اور اس کی ''نظر''۔۔۔

اس نے دُلہن کو صبح سویرے طلاق دی۔

عہدِ جوانی

لڑکے نے مستقبل کے خطروں سے بچتے ہوئے کہا، ”جب بھی ہمارے ساؤنڈ باکس ڈیڈ ہو گئے نا! تو ہم فوراً الگ ہو جائیں گے۔“

”واؤ!۔۔۔ ہاؤ رومینٹک یاررر یعنی باتیں ختم ہونے کا مطلب ہوگا۔۔۔

طلاق۔۔۔ طلاق۔۔۔ طلاق

(لڑکی نے مردانہ آواز نکال کر، ہاتھ کو یوں جنبش دی جیسے کلہاڑی کے وار سے رشتہ کاٹ رہی ہو۔)

یاررر یہ فٹ ہے۔۔۔“

دونوں سر جوڑ کر اور ناک لڑا لڑا کر بہت دیر تک ہنستے رہے۔۔۔

تب ان دونوں کے لیے اس کرخت لفظ میں کتنی رومانویت تھی۔

طلاق کا مطلب تھا ایک خوبصورت تعلق کو تعفن سے بچا لینا۔۔۔

طلاق کا مطلب تھا کسی نئے نکور تازہ تعلق کی ایسی میٹھی سرگوشی سننا جو رواں رواں مرتعش کر دے۔

۔۔۔ لڑکے نے نئی نویلی شیروانی کے بٹن کو تازہ کاج میں ٹھونسنے کی مشقت کا لطف اٹھاتے ہوئے نکاح نامے پر یوں دستخط کیے تھے جیسے۔۔۔

۶۳!۶۲

ہم ہر کس و ناکس کا منہ کھول کر دانت گنتے تھے، کبھی کسی کے پپوٹے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر اس احتیاط سے کھولتے کہ کہیں آنکھ سرخ ہو کر مخمور نہ دکھنے لگے۔ ہمیں صادق اور امین کی تلاش تھی۔

بعض الٹرا ساؤنڈ صفت لوگ دوسروں کے خوابوں سے نیت کے مہین مہین ریشے مائکروسکوپ سے چیک کر رہے تھے۔

مسٹر کلین نہ کبھی تھا نہ مل رہا تھا۔۔۔تاج ایسے جہاں دیدہ کے سر جانا تھا جو دودھ بھی دے اور پر امن سینگوں پر تاج بھی اٹکا سکے۔۔۔یعنی، اللہ میاں کی۔۔۔یعنی اللہ میاں کی قربت بھی رکھتا ہو۔۔۔

ہنوز تلاش جاری ہے۔ دیکھیے۔۔۔
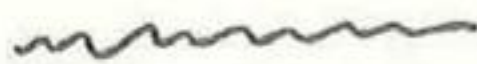
گندم

''سانڈ کے منہ سے گرنے والا دانہ یہ نہیں ہے۔۔۔وہ اور تھے۔۔۔دیکھ دیکھ یہ تو خشک ہے۔ذرا چُھو کے دیکھنا!!''

نکھٹو نے شہادت کی اُنگلی سے دانہ چُھو کر دیکھا۔

''ہاں، یہ تو خشک ہے۔''

اُنگلی کی گواہی اس دانے کے حق میں تھی۔۔۔مگر نکھٹو نے پھر سوچتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہے، پر مجھے تسلی نہیں ہو رہی پہلے کوئی گیلا دانہ تو دکھاؤ۔۔۔مجھے تو تمام دانوں پر شک ہونے لگا ہے۔۔۔مجھے گھن آنے لگی ہے سانڈ سارے میں منہ مار گیا ہے۔۔۔ میں سانڈ سے ڈرنے لگا ہوں، اس کے سینگ بڑے اور سینے کے پٹھے مضبوط ہیں۔وہ پھر آجائے گا۔''

دانہ دکھاتے ہوئے اس نے کہا۔

''یہ لو ایک اور۔۔۔''

نکھٹو نے پھر شہادت کی انگلی سیدھی کی دانہ چھو کر کہا،

''یہ بھی تو خشک ہے۔''

اس نے کہا،

''ارے ارے پاگل۔۔۔یہاں۔۔۔یہاں دانے کے چیر پر انگلی مس کر، ہاں اب ٹھیک ہے، یہاں سے گیلا ہوگا۔''

(وہ ہنس کر)

''تو بہت بھولا ہے دانہ چیک کرنا بھی نہیں آتا۔''

ابھی نکھٹّو نے دانہ چیک نہیں کیا تھا کہ اس نے سانڈ کے منہ سے گرا دانہ دور پھینک کر نکھٹّو سے کہا،

''چل یہ دوسرے صاف صاف ہیں، انھیں بھون کر کھاتے ہیں۔ آجا۔۔۔ شک، حلال کو حرام کر دیتا ہے۔۔۔شک نہیں کرتے۔''

سیکنڈ ہینڈ

''ان دونوں میں تو بڑا مثالی اور روایتی قسم کا عشق ہوا کرتا تھا۔ معمولی سی درز نہیں چھوڑتے تھے بیچ میں کہ کہیں کوئی تیسرا نہ آجائے۔ مجھے یاد ہے رضا کا افسانہ ہو یا عنبرین کا کینوس بس وہی دونوں۔۔۔ یک جان دو قالب۔۔۔ آخر رضا اور عنبرین میں علیحدگی ہوئی کیسے؟''

اس نے دکھ بھرا لہجہ بنانے کی ناکام کوشش کی اور پوچھا۔

جواب دینے والی نے جواب دیا کیونکہ وہ سب کچھ جانتی تھی۔

''رضا دنیا کو لفظوں میں دیکھتا تھا جبکہ عنبرین رنگوں میں۔۔۔ آخر میں ان دونوں کے رنگ اور لفظ آپس میں الجھ گئے۔۔۔ سو وہ الگ ہو گئے۔''

کچھ توقف کے بعد اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا،

''اب ان دونوں کے درمیان بہت بڑی دراڑ پڑ گئی ہے۔ اتنی بڑی جتنی دو براعظموں کے بیچ ہوتی ہے۔۔۔ رضا بہت اکیلا ہو گیا ہے بالکل تمھاری طرح اگر تم چاہو تو۔۔۔''

پہلی نے درد بھرا قہقہہ بلند کیا اور گویا ہوئی،

''میرے لیے اب لذت ملنے میں نہیں، اس کے تنہا تڑپنے میں ہے۔''

دوسری جو سب کچھ جانتی تھی بولی،

''پھر بھی اگر تو کہے تو۔۔۔''

پہلی نے نفی میں سر ہلایا۔۔۔

دوسری جو سب کچھ جانتی تھی۔ حکمت کا پلو اوڑھ کر کہنے لگی،

''سوچ لے۔۔۔ دیکھ! مرد کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کبھی سیکنڈ ہینڈ نہیں ہوتا۔۔۔ تو ایک بار پھر سوچ لے۔''

کترتی آنکھیں

ہم نے کپڑے کی کٹنگ دیکھی اور حیران ہوئے، اللہ توبہ ہم یہ کیسے پہن سکتے ہیں؟
لیڈی فٹ سے بولی سلنے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔

ہم نے کہا دیکھو جی! یہ کٹنگ کسی مرد ڈیزائنر کی ہے۔ ہم مشرقی عورت ہوتے ہیں۔ وہ نگوڑا جس قینچی سے کاٹتا ہے ہم خوب جانتے ہیں۔۔۔ ہم اس کی حسرتوں کی کترن کر ڈالیں گے یہ نہیں پہنیں گے۔ پاس کھڑی لیڈی نے ہمیں یوں گھورا جیسے گنوار جاہل کو دیکھنے کا حق ہوتا ہے۔۔۔

ارے بھئی! کچھ نہیں ہوتا مجھے دیکھو (وہ بازو پر دوپٹہ اٹکا کر لٹو کی طرح گھوم گئی) مرد ڈیزائنر سے کیا ہوتا ہے۔

جی میں آیا کھڑے کھڑے وہ صلواتیں سناؤں کہ فرنگی نما ہیجڑے کی عقل ٹھکانے آجائے لیکن لیڈی ہمارے حقوق پر بہت بولی تھی، ہمارے سو سو کام کیے تھے۔۔۔ ہم نے چپ سادھ لی۔۔۔

۔۔۔ سو، اسی مردوے کا قینچی کٹا پہن لیا۔۔۔
خیر جب آئینے کے سامنے ہم خود لٹو ہوئے۔۔۔
تو سوٹ کی پھبن ہی نرالی تھی۔

کوئی ایک آدھ لمحے کی کہانی

لمحے کے کروڑویں حصے کے پاؤں سو سو من کے ہو گئے ہیں۔ جملہ جاری ہے۔۔۔
حرف حرف رینگتے ہوئے معنی، جسم میں، کبھی خوف تو کبھی گدگدی بھر رہے ہیں۔ جملہ مکمل ہوتا چلا جا رہا ہے۔۔۔

۔۔۔لیکن اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ کوئی اشارہ نہیں دے رہے۔۔۔

سو، اب میں آنکھیں بند کیے ہمہ تن گوش ہوں۔ بند آنکھوں میں منظر اور پس منظر کے رنگ، متضاد رنگوں میں تیزی سے بدل رہے ہیں۔

۔۔۔یہ دیکھو! ابھی سفید تھا، لو! سیاہ ہوا۔ یہ سرخ ہو کر یرقانی زرد۔۔۔ دل ایک دھڑکن سے دوسری دھڑکن تک کتنی کیفیتوں کے نشتر سہہ رہا ہے۔ بند آنکھوں پر پپوٹوں کی بے چینی سے پلکوں کے تیر اپنا ہدف بدل دیتے ہیں۔

جملہ آخری۔۔۔ فعل تک پہنچے یا نہ پہنچے۔۔۔ سانسیں رکنے لگی ہیں۔ جملہ بغیر کسی تاثر کے جاری ہے۔

عالمی دن

جیسے ہی موبائل کی سکرین آن ہوئی تو ماؤں کی تصویروں سے بھری فیس بک نے احساس دلایا کہ آج ایک اور عالمی دن اس کا منتظر ہے۔

ابھی چند دن پہلے یکم مئی کو بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ ایسے موقعوں پر اپنا حصہ ڈالنا صرف ضروری نہیں بلکہ فرض ہوتا ہے۔

وقت تو اس کے پاس تھا نہیں کہ ماں کے روایتی تصور پر کوئی طویل پوسٹ لکھ کر ڈھیروں لائیکس اکٹھے کرے۔ اس نے سوچا کیوں نہ وقت بچاتے ہوئے وہ نینو فکشن کا سہارا لے۔

ڈنڈا

اس نے غصے میں آ کر کہا ڈنڈا کہاں ہے؟؟۔۔۔ڈنڈا ملازم نے کہیں چھپا دیا تھا۔
لوگ کہتے تھے کہ اس وڈیرے کو دانش مند ملازم نے بچا رکھا تھا۔

وہ مسائل کا حل دلیل کے بغیر چاہتا تھا۔اس کا ایمان تھا کہ دلیل اور ذلیل میں صرف ایک نقطے کا فرق ہے۔کوئی ایک کمزور پوائنٹ آپ کا، یا کوئی ایک مضبوط پوائنٹ مخالف کا، آپ کو ذلیل کرنے کے لیے کافی ہے۔پھر ذلیل ہو کر کئی رات شرمندگی سونے بھی تو نہیں دیتی۔غیرت مند ہونا بھی کتنا بڑا عذاب ہے۔

اب وہ تھا بھی مجلسی بندہ، ابھی مجلس میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ محفل سے اچانک ایک سوال آیا۔۔۔اس نے کچھ دیر سوچا، پھر غصہ کرنے کا فیصلہ کیا۔۔۔وہ چلایا، کہاں ہے میرا ڈنڈا؟؟۔۔۔ڈنڈا ملازم نے کہیں چھپا دیا تھا۔

گُل و بُلبل

یہ عشقیہ ترانہ قدیم ہی نہیں ہو رہا تھا۔اس کے ساتھ والے کمزور ہو ہو کر نیک ہوتے جاتے تھے۔بعض تو اب مصلے پر اس عاجزی اور احتیاط سے بیٹھتے تھے جیسے شدید زلزلے کے جھٹکوں کے دوران بیٹھا جاتا ہے۔ایک وہ تھا کہ ابھی تک بلبل جیسا خوش الحان تھا۔گلوں کی مہک اس کے قویٰ کو مضمحل نہیں ہونے دیتی تھی۔۔۔اب تو اس کے بیٹے بیٹیاں اٹھتے بیٹھتے گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے لگے تھے۔۔۔اسے اچھا تو نہیں لگتا تھا،لیکن وہ کیا کرتا۔یہ کمبخت ترانہ قدیم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

کم حسن / زیادہ حسن

کہانی تو کوئی خاص نہیں تھی لیکن اس سوپ ڈرامے نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی، جو ڈرامہ رائٹر، ڈائریکٹر اور اداکاروں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔۔۔ جمال پرست نفسیاتی مریض بننے لگے تھے۔ ڈرامے کی ریٹنگ بڑھ رہی تھی۔

ہوا یوں کہ سوویں (۱۰۰) قسط میں نئی ہیروئن نے پہلی کے حسن کو یوں گہنا دیا کہ جمال پرست انگشت بدنداں رہ گئے۔

یہاں صرف حسن اور کم حسن والا معاملہ ہوتا تو شاید برداشت کر لیا جاتا۔۔۔ دوسری ہیروئن نے ایسی جاندار انٹری دی کہ پہلی بدصورت ہو کر رہ گئی۔ نئی ہیروئن کا میانہ قد جھلمل جھلمل کرنے لگا۔ پہلی کا لمبا سرو قد لمڈھینگ ہو کر رہ گیا، بڑے کشادہ ہاتھ، بھاری بھر کم گھٹنے، موٹے موٹے ٹخنے، لمبوترے پاؤں نسوانی کی بجائے، پہلوانی لگ دینے لگے۔ اس کی وہ آواز جو کانوں میں مٹھاس گھولتی تھی ترش اور بدذائقہ ہو کر رہ گئی۔ پھر سوویں قسط میں وہی کچھ ہوا۔ اب میانہ قد اپسرا تیسری کے سامنے ٹھگنی ہو کر بدہیئت ہو گئی۔

ہزارویں قسط تک پہنچتے پہنچتے کہیں حسن اور کم حسن والا معاملہ بنا ہی نہیں۔۔۔ حسن مسلسل بدصورتی میں بدلتا جا رہا تھا۔

حسن پرست ذہنی مریض بن بن کر غاروں اور جنگلوں میں اپنے تخیل کے سہارے دائمی حسن تلاش کرنے لگے تھے۔۔۔ ڈرامے کی ریٹنگ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔

نشیب

''میں نے دریا سے منہ پھیر لیا ہے۔'' میرا اعلان سنتے ہی۔۔۔کھنچی ہوئی کمانوں سے زہر میں بجھے فتووں کی بارش ہونے لگی۔ لاؤڈ سپیکروں سے آوازوں کے نشتر بھی فضا میں بلند ہوئے۔۔۔بکتا ہے۔۔۔ملعون بکواس کرتا ہے۔ دریا دیوتا ہوتے ہیں۔ تہذیبوں کی آبیاری کرتے ہیں۔ آدم زاد جیسے حیوان کو مہذب انسان بناتے ہیں۔ ان دریاؤں کی روانی دیکھو، سیراب کرنا دیکھو، باربرداری دیکھو اور دیکھو۔۔۔ اور دیکھو۔۔۔ اور دیکھو۔۔۔

میں نے تو دریا سے منہ موڑ لیا ہے۔ جس کا سفر، جس کی روانی نشیب کی طرف ہے۔ جو مجھے پستی کی طرف لے کر جاتا ہے۔ میں نے اس منہ زور کی مخالف سمت سفر کرنا ہے مجھے بلندی سے پستی کی طرف دیکھنا اچھا لگتا ہے۔

سوّر، کتا، حرامی

ہائے دیکھو دیکھو جیسے چھوٹا سا سور کا بچہ ہو، کتنا پیارا ہے گپلو گپلو شا۔۔۔ہائے ہائے جیسے مونو سا کتے کا بچہ ہو، اسے میں اتنے زور سے کاٹوں نا!!!۔۔۔حرامی مزے کا گولٹو مولٹو ہے۔ میرے دانتوں کو کچھ ہو رہا ہے۔ کھا جاؤں اسے۔۔۔

وہ معصوم بچوں کو دیکھ کر دیوانی ہو جاتی تھی۔ اس کے پورے جسم سے بے ساختہ لاڈ، اُبل پڑتا تھا۔ حیرت ہے، ایسے عالم میں کبھی بھی اس نے معصوم بچوں کو کسی، حلال چیز سے تشبیہ نہیں دی۔

وہم نہیں تو اور کیا

آٹھ اکتوبر کا سورج بے نیازی سے گزر رہا تھا۔ شہر ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ ماں کے دعا کے لیے بنے ہاتھ موت نے زمین کی طرف موڑ دیے تھے۔ باپ کا سہارا ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ بہنوں کی شوخیاں، آہیں بن کر زمین میں دفن ہو چکی تھیں۔ بھائیوں کے بازو ٹوٹ کر بکھرے پڑے تھے۔ آج دولت، زمینیں، کوئی چیز بھی کسی قسم کی مدد کے لیے تیار نہ تھی۔۔۔ اس نے سخت زمین پر تیز دھوپ میں لیٹے ہوئے، نیلی چھتری کی طرف دیکھا۔۔۔ سورج تو آسمان سے نیچے تھا۔۔۔ اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں اور سوچا۔۔۔ نیلی چھتری۔۔۔ تو کچھ ہی دیر میں وہ ٹھنڈے سائے میں بہت آرام سے تھا۔
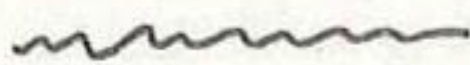
لافانی ہونے کا دکھ

موت کو ایک جانور کی صورت میں لا کر ذبح کر دیا گیا۔ تمام کتے بلے لافانی ہونے کی خوشی میں نعرے بلند کر رہے تھے۔ ہر ذی روح جس صورت میں تھا اور جذبے کے اظہار کے لیے جو زبان بولتا تھا۔ اسی بولی میں شکر ادا کر رہا تھا۔

دُنیا کو موت سے پاک کر دیا گیا تھا۔

سر پر لٹکتی موت کی تلوار اب پھولوں کی نرم و نازک بیل بن گئی تھی۔ اس پر زندگی مہکتی تھی۔

آبِ حیات کے کنارے بیٹھا ہڈیوں کا پنجر بنا کوا پھولوں کی کومل بیل کو دیکھ کر بہت افسردہ تھا۔

والد

(جنھیں میں اجی کہتا تھا)

اجی نے کہا تھا دنیا گول ہے بیٹا پاؤں سنبھل کر رکھنا جب تک پیروں کے پنجے اور ایڑی مل کر پورا قدم نہ بنائیں دوسرا پیر مت اُٹھانا۔ مجھ سے تو پہلا قدم ہی پورا نہیں بن رہا۔ میری پنڈلیوں کے پٹھے اتنے مضبوط نہیں ہیں، اجی! جتنے آپ کے تھے۔۔۔ مجھے آپ بہت یاد آتے ہیں۔

مرغ اذان نہیں دے گا تو۔۔۔

غصے میں ہانپتے ہوئے حکمت کی کتابیں اس نے میز سے اٹھا کر ایک الماری میں رکھیں اور قفل میں چابی اس زور سے گھمائی کہ جیسے شہر کے تمام تالوں کے چھید، اس نے ایلفی سے بھر دیے ہوں۔ وہ کانوں میں انگلیاں دے کر بہت دیر تک ماں کی گالیاں بکتا رہا۔

گولیاں اور کشتے اس کی معیشت کا واحد سہارا تھے مگر گلی میں بچوں کے ہجوم اور ان کے شور نے اسے پاگل کر دیا تھا۔

غیرت / بے غیرتی

مجھے ارشد نے بازو سے پکڑا اور ہونٹوں پر انگلی مَس کی تو میں نے خاموشی کو بقا جانا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ میں بولنا چاہ رہا تھا اور غصے میں سرخ بھبھوکا ہو کر کانپ رہا تھا۔ میری غیرت یہ سب کچھ گوارا نہ کر سکتی تھی، لیکن ارشد کے کہنے پر میں بھی نظریں نیچی کر کے سب کی طرح چپ ہو گیا۔

غصے میں سرخ چہرہ ماتھے کی ننھی ننھی بوندوں نے ٹھنڈا کر دیا۔ جسم کا درجہ حرارت نارمل ہوتے ہی، چہرے کا رنگ پہلے جیسا گندمی ہو گیا۔ جسم کی کپکپاہٹ ختم ہوئی تو دل کی دھڑکن سانسوں کی مالا کا ساتھ دینے لگی۔ سب کچھ نارمل ہو گیا۔

باہر نکلے تو ارشد نے میرے ضبط اور میں نے اس کی دانش مندی پر ایک ایسا زوردار قہقہہ لگایا کہ ہمارے منہ کے شوکیس میں رکھے آخری دانت تک بے غیرتی کی چمک سے دمک رہے تھے۔

ہائے اس زود پشیماں کا۔۔۔

''میرا جسم اچانک اتنا وزنی ہو جائے گا کہ زمین اس کا بوجھ نہ سہار سکے گی۔ ماں دھرتی کا مضبوط سینہ خود بخود ایسا گداز ہو گا کہ میں پاتال کی طرف دھنسنے لگوں گا۔

میرے اردگرد صدیوں سے جا بجا دلدل تو موجود تھے۔ میں انھیں دیکھتا بھی رہا تھا۔۔۔ لیکن کبھی سنجیدگی سے ان کے بارے میں سوچا نہیں تھا لیکن یہ دلدل کمبخت تو۔۔۔''

گارا جب نتھنوں کو چھونے لگا تو عمر دراز صاحب نے سوچنا شروع کیا۔۔۔

ڈپریشن

سُرمئی شام نے چند لمحوں بعد اپنی سلونی فضاؤں فنا کی ہتھیلی پر رکھ دینی تھی جیسے شبنم کا قطرہ سورج کی کرنوں کو گولی کی طرح آتا دیکھ کر سرینڈر کر دیتا ہے۔

منظر بدل جاتا ہے۔

حسن بدل جاتا ہے۔

علم بدل جاتا ہے۔

زر کی قدر و قیمت بدل جاتی ہے۔

عروج و زوال کی عمر کا تعین قدرت کرتی ہے۔۔۔ تو پھر ہم روبورٹ نما لوگ۔ یہاں کیا لینے آتے ہیں؟

اگر ایسا ہی ہے تو۔۔۔

نور، نے ناران میں خوبصورت عمارت لے کر اسے صرف جنت ہی نہیں بنایا بلکہ اس کا نام بھی ہوٹل الجنت انٹرنیشنل رکھا۔

وہ چاہتا تھا کہ نصرتی بھنگی کو ساتھ رکھے کیونکہ وہ کام میں رائی برابر کوتاہی نہ کرتا تھا۔

نور کے ابا المعروف پیر سائیں (جو بہت بڑے واعظ تھے) اس بات کے سخت خلاف تھے وہ تو نصرتی کو کہتے ہی بھڑوا تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دوسرے نام کی نسبت وہ تھا بھی اسم بامسمّٰی۔

ایک مدت کے تجربے کے بعد نور نے سوچا کہ جب درجۂ حرارت گرتا ہے۔۔۔ جب وادی پاکیزہ سفید چادر اوڑھ لیتی ہے تو سیاح آنا چھوڑ دیتے ہیں۔ خالی ہوٹل جنگل ویرانا بن جاتا ہے، وحشت ہونے لگتی ہے، لیکن جب خوشگوار ہواؤں سے درخت کسی حسینہ کی طرح اپنی زلفیں فضا میں بکھیرتے ہیں۔ شاخوں کے بازو کھول کھول کر یوں لہراتے ہیں جیسے گلے لگنے کے لیے بے تاب ہوں۔ جھرنوں کے نغمے بلند ہوتے ہیں۔ رنگ رنگ کے گل مشک فشاں ہوتے ہیں تو رَش لگ جاتا ہے۔

یہ سوچ سوچ کر اسے اپنا آپ نصرتی بھنگی جیسا لگنے لگا، جسے پیر سائیں پسند نہیں کرتے تھے۔

بیل خوبصورت ہے

''بیل بہت خوبصورت اور صحت مند جانور ہے، اتنے خوبصورت اور صحت مند جسم میں ایک توانا دماغ ہی ہو سکتا ہے۔ بادشاہ سلامت اسے مشیر رکھ لیجے۔''

لومڑی مشورہ دے کر با ادب کھڑی ہو گئی۔

سور، جو بیل سے بیر رکھتا تھا۔ اس نے بیل کے احمق ہونے پر سو دلیلیں دے کر کہا، ''یہ جانور سر نیچے کر کے کام کرتا ہے۔ یہ اتنا بے غیرت ہے کہ آختہ ہونے پر اور زیادہ محنتی ہو جاتا ہے۔ عالم پناہ! جو اپنی نسل کا دفاع نہیں کر سکتا وہ ملک کا کیا دفاع کرے گا؟

جب سور کی بات مکمّل ہو گئی، تو بادشاہ نے لومڑی کی طرف دیکھا۔ لومڑی نے مسکراتے ہوئے کہا،

''حضور یہی تو میں بھی کہہ رہی تھی، فاضل دوست تو ویسے اس بے چارے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اصل میں اللہ نے کوئی چیز فالتو تو بنائی نہیں ہے، اگر اس کے پاس دماغ نہ ہوتا تو اسے اللہ میاں اتنے بڑے سینگ کیوں دیتے؟''

سؤر، اُٹھ کھڑا ہوا،

''حضور! سینگوں کا دماغ سے کیا تعلق۔۔۔؟''

لومڑی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا،

”حضور تعلق ہے، اگر اس کا دماغ گٹوں میں ہوتا تو مرغ کی طرح اس کے سینگ پیروں میں نہ ہوتے؟ ظاہر ہے سر میں دماغ ہے تو اس کی حفاظت کے لیے سر پر سینگ ہیں۔“

بادشاہ نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا،

”ٹھیک ہے کل سے اُسے بلا لو۔“
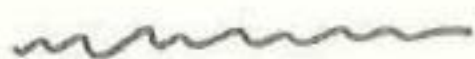
دریا کی ایک نہ سننا

دریا کی سنتا بھی کوئی نہیں تھا۔

وہ کہتا تھا،

میں جب چل پڑتا ہوں تو پھر رکتا نہیں کیونکہ میرے ساتھ ایک جہان چلتا ہے، پھلتا پھولتا ہے، فصلیں، درخت، گھاس، جھاڑیاں، پرند، چرند، کیڑے مکوڑے، ہی نہیں، تہذیبیں تک پروان چڑھتی ہیں۔ میں رک گیا تو صرف میں نہیں رکوں گا۔ زندگی رک جائے گی۔ میری قربت میں اطمینان سے رہو، اپنی درانتیاں اور ہل خوب تیز رکھو، کلہاڑیاں، کند کرلو اور مجھے بہنے دو۔

جیسے اس کی زبان جاننے والے سب مر کھپ گئے تھے۔ اس نے پھر کسی مضبوط چٹان پر اپنی زبان پٹخی۔ آواز پیدا ہوئی۔ ارے کم بختو! کلہاڑیاں کند کر دو، درخت میری میخیں۔۔۔ دیکھو میری چولیں ڈھیلی مت کرو۔۔۔ اپنی موجودہ حالت پر مطمئن رہو۔۔۔ نہیں تو سب کچھ بدل جائے گا۔

۔۔۔ آخر کار پہاڑ نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پہاڑ سدِ راہ ہوا تو دریا مٹ گیا۔

اب وہاں جھیل ہے۔

زندگی آج بھی پیکر بدل کر ویسے ہی جھیل کے کنارے بہہ رہی ہے، جیسے کبھی دریا بہتا تھا۔
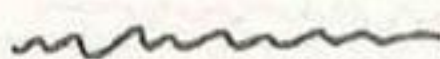
سراب

صحرا کی وسعت میں ریت ہی ریت لمحوں کی طرح بکھری پڑی تھی۔ ہم جب بھی ذرے گننے بیٹھتے تو گنتی دم گھٹنے سے مرجاتی تھی۔

چاروں طرف ذرا سی دوری پر یعنی بالشت بھر فاصلے پر خواب، کیکٹس کے پھول کی طرح تلخ منظر کو رنگین کیے ہوئے تھے۔

ہم خوابوں کو پانے کے لیے قدم اٹھانے لگتے تو ریت دب جاتی تھی۔ ریت دبنے سے ہماری جسمانی رفتار، خیالوں کی رفتار کے مقابلے میں اتنی کم ہو جاتی کہ خواب سراب بن کر چھو منتر ہو جاتے تھے۔

اس سفر میں ہر ذرے پر پیاس چمکتی تھی۔ پانی کی بوتلیں خاص پودوں نے جڑوں میں جکڑ رکھی تھیں۔ جن کے سر پر صحرائی تجربے کا تاج تھا۔ جو درختوں کا قتل جائز سمجھتے تھے۔ وہ جڑیں نچوڑ کر پانی پی لیتے تھے۔ اس ماحول میں بھی، ہم سے تھوڑا زیادہ جی لیتے تھے۔ ہم سے ناتجربہ کار تھک تھک کر مرتے تھے اور ریت بن بن کر صحرا کی وسعت میں اضافہ کرتے تھے۔

محنت فروش

آج اسے لینے کوئی نہیں آیا۔۔۔

اس نے ''وہ'' پسینہ پونچھا (جس کے متعلق کوئی فرمان نہیں تھا۔)

وہ اٹھا اور بیلچہ کاندھے پر رکھ کر۔۔۔

خودکشی

''دیکھ لو۔''

''دیکھ لیا۔''

''کیا نظر آیا؟''

''وہی جو پچھلے منظر میں تھا۔''

''اچھا تو پھر چلنا شروع کردو، دیکھو میرے پیچھے پیچھے آنا۔ قدم پر قدم خوب دبا دبا کر رکھنا۔''

''اچھا استاد۔''

(پھر پاؤں چھلنی کر دینے والا سفر۔۔۔ ایک مدت کے بعد استاد نے آنکھوں سے پٹی ہٹائی اور پوچھا)

''اب دیکھ بچہ۔''

''دیکھ لیا۔''

''کیا نظر آیا؟''

''سب وہی ہے استاد۔ کچھ نیا نہیں۔''

''اچھا! چل، ہمیں پھر چلنا ہوگا۔ راستہ طویل ہے۔۔۔''

”نہیں استاد، تیرے نو (۹) سفر پورے ہو گئے، معذرت!! میں تیرے ساتھ اور آگے نہیں چل سکتا۔ مجھے ایک استاد کے ساتھ صرف نو (۹) تک سفر کرنے کی اجازت ہے۔ اب میں نیا استاد تلاش کروں گا۔“

اس کے بعد اسے ساتواں استاد بھی مل گیا۔ نو طویل سفر کیے گئے، ہر سفر کے اختتام پر وہی مکالمے دہرائے گئے۔۔۔

لڑکے کی طلب صادق تھی سو، اسے تشفّی نہ ہوتی تھی۔

آٹھویں استاد کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

آج لڑکے کا دل ڈر رہا ہے۔ وہ سوچ رہا ہے، نو سے آگے تو ہندسے بھی مرجاتے ہیں۔ نو کے بعد پھر سے سب کچھ دہرایا جاتا ہے۔

آج نویں استاد کا نواں سفر جاری ہے۔ لڑکا اس کے ہر نقشِ قدم پر خوب دبا دبا کر پاؤں رکھ رہا ہے۔ اس کا دل ایک ایک قدم پر نو نو بار دھڑکتا ہے، مگر وہ چلتا جا رہا ہے۔

چُپ کی داد

وہ اتنی باتیں کرتی تھی، جتنا اس کے آموں پر بور آتا تھا۔کئی ایکڑ پر پھیلے باغ میں ہر درخت جوان اور شاداب تھا، کتنا زیادہ بور آتا ہوگا ان درختوں پر؟

اسے جب تھر میں بیاہا گیا تو آم کے سارے پیڑ سوکھ کر لکڑی بن گئے تھے۔سوکھی لکڑیوں پر کتنا بور آسکتا ہے۔اسی لیے تو اس کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی ہے۔

بھگانا؟

لڑکا: یہ کوئی محبت تو نہ ہوئی نا۔۔۔تم مجھے کہاں لے کر جا رہی ہو۔۔۔

لڑکی: (ہنستے ہوئے) میں تمہیں؟؟؟ یہ تو تم مجھے بھگا کر لے جا رہے ہو۔

لڑکا: (حیرت سے) میں؟؟؟ یہ تو تو نے کہا تھا کہ چلو بھاگتے ہیں۔

لڑکی: چل چل مرد بن میں لڑکی ہو کر نہیں ڈرتی۔۔۔اور تو۔۔۔

لڑکا: میں نہیں بھاگنا چاہتا دیکھ۔۔۔بے عزتی ہوگی۔ (وہ رک گیا)

لڑکی: (روتے ہوئے) مجھے گھر سے نکال کر اب۔۔۔اب۔۔۔میں خودکشی کر لوں گی۔۔۔

لڑکا: اس میں میری مرضی نہیں تھی۔ میں تو تیرے طعنے سن کر بھاگا تھا لیکن اب نہیں۔۔۔تو جو مرضی ہے کر، مر، میں، واپس جا رہا ہوں۔

لڑکی: (غصے میں) نامردوں والی باتیں مت کر کھسرے کہیں کے۔۔۔چل میرے ساتھ (لڑکی زور سے چیخی) لڑکے نے کپڑے درست کیے اور سینہ تان کر لڑکی کو کسی نامعلوم دیس کی طرف بھگا کر لے گیا۔

دُلہن

''یہ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک وہ نہیں ہے، جو دلہن بن کر نظر آتی تھی۔ اتنے رنگ اتنی خوشبوئیں۔۔۔ اتنا دھوکہ؟''

بوڑھے دلہے نے کالی کلوٹی معصوم لڑکی کو خوب پیٹنے کے بعد اس کی ماں سے کہا۔۔۔

ماں بے وقوف ہوتی تو کہہ سکتی تھی کہ آپ کے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے، پہلے آپ اندھے تھے؟

ماں سیانی تھی، سمجھ گئی۔ وہ اپنی فتح، یوں ہار میں کیسے بدل سکتی تھی۔ وہ اپنی روتی ہوئی بیٹی کو چھوڑ کر، ملک صاحب کے پاؤں میں بیٹھ گئی، اور انھیں نیا تلے والا گھسہ پہناتے ہوئے بولی، ''ملک جی مجھیا کرو نا، نویں جُتی کُجھ دن تے تنگ کر دی اے۔۔۔ تسی پریشان نہ ہو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جاسی۔''

پھر بیٹی کو دو تھپڑ لگا کر آہستہ سے کہا، ''پہلے ہی دن بڈھے سے مردوں والے تقاضے، شرم کر۔۔۔ بے غیرت۔''

اللہ اکبر

آج اس روبورٹ نے نماز پڑھانا تھی۔ جس کا لباس چائنہ کی ایک کمپنی نے غلافِ کعبہ سے بنایا تھا۔ اس کا حلیہ بے تحاشا مذہبی تھا۔ سو ہمیں اس کی پیروی سے کون روک سکتا تھا۔

۔۔۔اللہ اکبر۔۔۔

حدِ نگاہ صفر

میں نے اپنی ذات کی دھند اور گرد سے اٹے ماحول میں، کسی دوسرے کا ہیولا
محسوس کیا تو پوچھا:

”کیا میں تجھے دکھتا ہوں؟“

اس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا

”کیا، یہاں میرے علاوہ بھی کوئی ہے؟“

مذاق نہ کر یار

ایک رُوح نے دورانِ پرواز با آوازِ بلند خود سے کہا، ''کتنا بےکار عمل تھا ایک جسم میں رہنا۔''

ساتھ سے گزرنے والی دوسری روح نے چونک کر دیکھا اور پرواز کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''اری! اداس روح!! تو کس جسم کی قید میں رہی؟''

پہلی روح نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا، ''پتا نہیں ایویں کوئی فضول سا بندہ تھا۔۔۔ ویسے دورانِ حبسِ بےجا، میری کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

دوسری رُوح نے تاریک خلاؤں میں ایک زوردار طنزیہ قہقہہ بلند کیا۔

پہلی رُوح نے قدرے غصے سے پوچھا، ''کیوں جی اس ہنسنے کا سبب کیا ہے۔ جس جسم میں تو آباد رہی، کیا اس سے تیرا یارانہ تھا۔ کیا تم دونوں روح اور مٹی ایک ہو گئے تھے؟''

دوسری نے پھر تاریک خلاؤں میں پھلجھڑی چھوڑی۔۔۔ ''مذاق نہ کر یار!! مجھے کچھ نہیں پتا۔۔۔ ہاں! شاید اس بندر کو کچھ پتا ہو جو مجھے تمام عمر ڈالی ڈالی اچھالتا رہا۔''

اقبال تیری کہانی کمزور ہے

(اسلام آباد سے ایک خبر، نائب قاصد اقبال نے خودکشی کرلی)

اقبال کہانی بنا نہیں سکا۔ ایک نائب قاصد کی غربت کیا کہانی بنا سکتی ہے؟

''میں بیمار ہوں۔۔۔'' (اقبال نے کہا)

''ہاہاہا نہ اقبال نہ یہاں سب بیمار ہیں۔''

''میں ریٹائر ہونے والا ہوں۔۔۔''

''او نہیں اوئے!! نہیں بھائی بات نہیں بنی۔۔۔''

''مجھے سرکاری گھر چھن جانے کا خوف ہے۔''

''یار بس کردے رلائے گا کیا! ہاہاہا۔۔۔''

''بیٹا بے روزگار ہے۔۔۔''

''نہ اقبال نہ یوں نہیں چلے گا۔''

''مجھے افسر نے بتایا ہے کہ دوران ملازمت مرجانے والے کے بیٹے کو ملازمت ملتی ہے۔ زندگی میں نہیں مل سکتی۔''

''یار اقبال اب تو تو بالکل بونگیاں مارنے لگا ہے۔''

''دیکھو! دیکھو، میں اپنا بیٹا دفتر میں چھوڑ کر چھت پر آگیا ہوں۔۔۔''

"اقبال! کہانی خالی خولی دھمکیوں کے سہارے نہیں چلتی۔"

"لو میں گیا۔" (اقبال کود گیا)

"ہاں اب تو چھت کی بلندی سے پستی کی طرف آ رہا ہے، اب کچھ کچھ کہانی شروع ہوئی ہے۔ مان لیا۔۔۔ اقبال تجھے مان لیا۔۔۔ تو نے کہانی شروع کر دی ہے۔"

ہم تجھے پستی کی جانب آتا دیکھ رہے ہیں۔ تو نیچے گر، تو مر، پھر دیکھتے ہیں۔ تیری کہانی ادبِ عالیہ کی طرح انجام پر کیا سوال اٹھاتی ہے۔ ویسے سوال تو ہم رزیلوں کے تعفن زدہ ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن تو کوشش کر۔۔۔"

۔۔۔سوال۔۔۔سوال۔۔۔سوال۔۔۔

"کیا اب قوانین کے مطابق اس کے بیٹے کو نوکری مل جائے گی؟؟؟"

۔۔۔سوال۔۔۔سوال۔۔۔سوال۔۔۔

"کیا اس کا جنازہ پڑھا جا سکتا ہے؟"

"ہاہاہا!!! اقبال تو ایک ناکام کہانی کار ہے، تو ہمیں نہیں جھنجھوڑ سکا تو کوئی نیا سوال نہیں اٹھا سکا۔۔۔ جا مر جا۔"
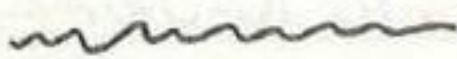
خواہشوں کے قطبین

ستاروں کی مدہم لو نے آسمان میں کشش پیدا کر دی تھی۔ نیلی پیلی روشنیاں کسی رخسار پر گلٹر کی طرح جھلمل جھلمل کرتی تھیں۔ آسمان کے کھلے گریبان میں کہکشاں کی لکیر آمادگی کی ہموار راہ بن گئی تھی۔

وہ چمکتی راہ مجھے دعوتِ پرواز دینے لگی۔۔۔ میں ہاتھ پھیلا کر آسمان کے قریب ہونے لگا۔ میں اُڑنے لگا۔

زمین ابھی اوزون کی اوٹ میں نہیں آئی تھی کہ رات کی رانی ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں پر ہولے ہولے رقص کرنے لگی، خوشبو کسی پُرکیف گیت کی طرح مچل مچل کر تھرکنے لگی۔۔۔ تھرکتے تھرکتے اپسرا کے خدوخال میں ڈھل گئی۔

میرا جسم دو حصوں میں بٹ گیا۔

جب بصارت مجھے آسمان کی طرف کھینچتی تو شامہ کرۂ زمین کو ساتھ ساتھ گھسیٹنے لگتی۔

کششِ ثقل نے میری پرواز میں کوتاہی پیدا کر دی۔ میں اُڑتے اُڑتے رک گیا۔۔۔ میں کھلی فضاؤں میں معلق ہو گیا۔۔۔ میں ستارہ بن گیا۔

دستِ بُریدہ رنڈوا

وہ پریشر کُکر ہے، پھٹ بھی سکتا ہے،

میں نے پہلے کہہ دیا تھا۔۔۔

اب پھٹا ہے تو بھگتو۔

پہلی محبّت

قسم ہے اس کے سیاہ بالوں کی جب وہ انھیں تیز ہواؤں کو سونپ دیتی ہے۔

اس دن دریا اُلٹا بہنا شروع ہو گیا تھا۔ بالائی علاقے زیرِ آب آگئے تھے۔ نشیبی علاقوں کی ایک کھائی میں، میں سہما ہوا کھڑا تھا۔

قسم ہے اس کی لمبی پلکوں کی، جب وہ انھیں جھپکاتی ہے۔

شام کو پانی کے فلک بوس پہاڑوں کے پیچھے سورج غروب ہو گیا تھا، لیکن اس کی روشنی رات گئے تک کھلی خوف زدہ آنکھوں کو لوری سناتی رہی تھی۔

قسم ہے اس کے سفید گال پر اُٹھے ہوئے مدھم تل کی۔۔۔ اس شب چاند طلوع ضرور ہوا تھا، لیکن اس طرح جیسے کسی نے تختی پر سلیٹی سے کچھ لکھ دیا ہو، یعنی چاند پوری طرح پڑھنے نہیں ہو رہا تھا۔

آنکھیں بالائی علاقوں کے فلک بوس پہاڑوں پر جمی ہوئی تھیں۔

قسم ہے اس کمر کی جب وہ ناز و انداز سے چلتی ہے۔

نشیبی علاقوں کا باسی جاگ رہا تھا، اس کی سانس پھیپھڑوں میں اٹکی ہوئی تھی کہ ایک ہچکولا، بس ایک ہچکولا، سب کچھ بہا لے جائے گا۔

فیصلہ

وہ اپنے جسم سے کچھ عجیب سی بو محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ خوشبو ہے یا بدبو یہ فیصلہ اس سے نہیں ہو رہا تھا۔

اس کشمکش سے اکتا کر اس نے بو پر قابو پانے کی کوشش کی۔۔۔ لیکن جب بھی وہ کوئی پرفیوم، کریم یا پاؤڈر لگاتا، تو اس کا بدن چھوتے ہی وہ چیزیں بے اثر ہو جاتیں، بس وہی بو اس کی شناخت بنتی جا رہی تھی۔

پہلے تو لوگوں کے قریب بیٹھ کر اس نے جاننے کی کوشش کی کہ وہ اس بو کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔۔۔ لوگ منافق ہوتے ہیں (اسی لیے تو ہمیں پیارے لگتے ہیں)۔۔۔ سونگھ سانگھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔

ان کم بختوں کے نتھنے تو ان سے بھی بڑے منافق تھے کہ ذرا سن گن نہیں دیتے تھے۔

اس کی شناخت کا مسئلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا اب خود ہی لوگوں سے پتا کیا جائے۔۔۔ سو مجبوراً اسے اعلان کرنا پڑا کہ، "مجھے سونگھا جائے"۔۔۔ وہ حقیقت تک رسائی چاہتا تھا۔

۔۔۔ تو پھر کیا تھا پہلے تو، خوب ٹھٹھہ مذاق ہوا۔ لوگوں نے طعنے دیے۔۔۔ فتوے

لگائے۔۔۔لیکن حقیقت تک رسائی کے لیے ضروری تھا کہ وہ سونگھا جائے۔

اسے سب برا بھلا کہہ رہے تھے۔۔۔لیکن اندر سے ہر مرد و زن چاہتا تھا کہ چلو ذراسا سونگھ بھی لیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔

۔۔۔پھر۔۔۔کچھ نڈر اور لبرل ایسے بھی تھے جنھوں نے، دوسروں کو چڑانے کے لیے اسے بیچ بازار سونگھنا شروع کر دیا۔۔۔ان کی دیکھا دیکھی کچھ شرفا اسے بند کمرے میں آکر سونگھ جاتے تھے۔ پھر مصروفیت اتنی بڑھی کہ لوگ اس سے وقت لینے لگے۔۔۔بعض خواتین تو رات کا وہ پہر مانگتی تھیں جس میں گھر سے نکلنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ مگر آتی تھیں، سونگھتی تھیں، چلی جاتی تھیں، کسی کو پتا بھی نہ چلتا تھا۔

اس کی شہرت جو دیکھی تو اور بھی کئی اہلِ نظر بینر لگا کر بیٹھ گئے۔ چند دنوں میں شہر ماہر و مشاق سونگھنے والوں اور سونگھانے والوں سے بھر گیا۔

۔۔۔وہ بے چارہ آج بھی وہیں کا وہیں کھڑا ہے۔ اسے ابھی تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ اس سے واقعی خوشبو آتی بھی ہے کہ نہیں؟
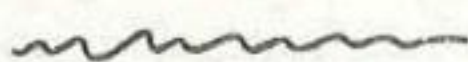
ایک خبر

دماغ کے ٹرانسپلانٹ کی خبر سن کر اس نے، باپ سے وراثت میں ملے تنگ و تاریک گھر کو کسی پراپرٹی ڈیلر کی نظروں سے دیکھا۔ پھر اس کی مناسب قیمت لگوائی۔

اس غریب کے سات ذہین ترین بچے تھے۔ جنھیں پڑھانے کا خرچ وہ نہ اُٹھا سکتا تھا۔

گھر کی قیمت کا حساب کتاب کر کے وہ بھاگا بھاگا، سیدھا سکول پہنچا اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا، ''میں بڑھاپے کے لیے انوسٹ منٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

خود مختاری

خوش گوار موسم نے اندر بہت ہلچل مچا رکھی تھی۔ گھنگھور گھٹائیں مست سمندر کی طرح دھمالیں ڈال رہی تھیں۔ سوچوں کے پنچھی ہواؤں میں پر پھیلائے موجیں مارتے تھے۔ یہی موسم، بس! یہی، موسم۔ جو طبیعت میں جنت بھر دیتا ہے۔ گنتی ایک سے ستر حوروں تک بہت آسان ہو جاتی ہے۔

ایسے موسم میں اس نے حکم دیتے ہوئے کہا، "دیکھو! میں ہر حد تک جانے کے لیے تیار ہوں، لیکن باہر کا موسم بدلنا نہیں چاہیے۔ اگر بدل گیا تو میں، میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کروں گا۔ میں اس رشتے کو کوئی نام نہ دے سکوں گا۔"

اس کی گرم سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔ وہ بولی، "نہیں بدلتا۔۔۔ تو فکر مت کر۔"

اس کی بوجھل آواز میں ایسا اعتماد تھا، جیسے سب کچھ اس کے اختیار میں ہو۔

اس عشق کی تو۔۔۔

صحرا میں ایک بگولا مجنوں کی خاکِ پا سے اُٹھا اور رقص کرتا ہوا، عالمِ وجد میں اپنے دائرے کی قید سے بھی آزاد ہو گیا۔ وہ تو فنا کی لذت سے سرشار تھا۔۔۔ لیکن صحرا سے ملے ہوئے شہر ویران ہو چکے تھے۔

دس روپے

وہ دس کا نوٹ کہاں ہے؟۔۔۔اس نے ماسک منہ سے ہٹا کر پوچھا۔

اٹینڈنٹ نے بے نیازی سے سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کر دیا۔ مریض کی گردن تو نہ گھومتی تھی۔ اس نے آنکھیں اس طرف گھماتے ہوئے بند کیں۔ آنکھیں اوپر کی طرف کھنچیں اور۔۔۔

موت کے تیسرے دن، جب اٹینڈنٹ کو کچھ دے دلا کر الوداع کیا جا رہا تھا۔ اس نے بیگم صاحبہ سے پوچھا کہ یہ دس روپے کی کیا حقیقت ہے۔ جس کا مرحوم ہر منٹ بعد پوچھتے تھے۔۔۔تو۔۔۔ بیگم صاحبہ نے موبائل کی سکرین پر انگوٹھا گھماتے ہوئے جواب دیا۔۔۔یہ ان کی پہلی کمائی تھی، پورے ایک مہینے کی مشقت۔۔۔اور دس روپے۔

اٹینڈنٹ نے عالی شان محل پر ایک حقارت بھری نظر ڈالی اور چل دیا۔
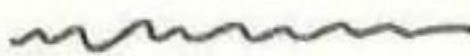
آزادیٔ رائے

نیشنل جیوگرافک چینل پر ایک چھپکلی کی ڈاکومینٹری دکھائی جا رہی ہے، جو بہت دور سے اپنی طویل زبان بڑھا کر شکار کرتی ہے۔ شکار بے چارہ ''دِلّی دُور اَست'' کے مصداق ابھی خطرے سے خود کو کوسوں دور سمجھ رہا ہوتا ہے کہ اچانک لیس دار زبان اسے شکاری کے وحشی جبڑوں میں کھینچ لاتی ہے۔

یہ ٹی وی چینلز بھی نا۔۔۔ کتنی زبان چلتی ہے ان کی۔

پگڈنڈی

پہاڑی راستہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا گاؤں سے بڑی شاہراہ تک پہنچتا تھا۔
ایک بابا جی چوٹی پر بیٹھے نیچے اترتے راستے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔۔۔یہ
سانپ تو میرے سارے بیٹے نگل گیا ہے۔

وہمی

''ماجد! تم نے غور کیا ہے؟ (اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو اتنا پھیلا لیا کہ اگر چاند ستارے بھی سما جائیں تب بھی لاکھوں نوری سال کا خلا باقی رہ جائے) ''پتا ہے، ہم دونوں نے آج تک جتنی سیلفیاں لی ہیں۔ ان میں کبھی بھی کوئی ''ایک وقت'' نہیں تھا۔ یہ دیکھو۔ (اس نے کپکپاتی انگلی سے تصویریں بدل بدل کر اپنے خوف کو اور مضبوط کیا۔)

میں: واؤ! کیسا حسین اتفاق ہے۔۔۔ لیکن اس میں ڈرنے والی کون سی بات ہے؟

وہ: (اُداسی سے) یہ دیکھو! کبھی سحر، صبح میں بدل رہی ہے، کبھی عصر اور شام کے رنگ ابھی جدا نہیں ہوئے (وہ روتے ہوئے) کبھی شام اور رات کی باریک ملگجی گھڑی۔۔۔ ماجد! یہ۔۔۔ یہ سب اتفاق نہیں ہے۔۔۔ اس عظیم کائنات کو کچھ اور ہی منظور ہے۔''

وہ ہر بات کو کسی عظیم کائناتی منصوبے سے جوڑ کر پُر اسرار بنانے کی عادی تھی۔ میں اس کے ملن کو اتفاقات کی لڑی میں پروتا تھا۔ میں آج بھی اس کی جدائی کو ایک اتفاقی واقعہ سمجھتا ہوں۔

گنے چُنے لفظوں کی کہانی

کہانی کار لفظ گن گن کر چُنتا اور پھر چُن چُن کر گنتا تھا۔

لفظ دارتاروں میں کہانی پھڑ پھڑا رہی تھی۔

ردالی حاضر ہو۔۔۔

''تجھ پر الزام ہے کہ تو نے لوگوں کو رلانا ترک کر دیا ہے؟۔۔۔غبار سینوں میں رکنے لگا ہے۔۔۔پریشر بڑھ رہا ہے۔۔۔کیا تو آج کل سینوں کی صفائی نہیں کر رہی؟''

''سرکار! ہم صفائی کرنے والوں کی کیا مجال جو آپ کی نافرمانی کر سکیں۔ اصل میں ہمارا کام بہت باریکی کا ہے۔ ہمیں لوگوں کے کالے پہاڑ جیسے غم یوں پگھلا کر آنکھوں سے بہانا پڑتے ہیں کہ آنکھوں کے مہین پردوں اور نازک آئینوں پر ہلکی سی خراش تک نہ آئے۔ وہ بے نور نہ ہوں۔ سب کچھ دیکھتے رہیں، لیکن برداشت کا جذبہ ہو کہ بڑھتا ہی چلا جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے سرکار۔۔۔اگر ہم خود بھوک سے مچلنے لگ جائیں گے یا خود سچ مچ کے غم زدہ ہو جائیں گے تو یہ نازک کام کیونکر ممکن ہو گا۔''

عالم پناہ نے یہ سنا اور سوچا کہ کہیں پریشر ککر محل کی دیواریں ریزہ ریزہ نہ کر دے، پھر فیصلہ صادر فرمایا، ''تجوریوں کے منہ کھول دو، کیونکہ ایک خوشحال ردالی ہی ماتم میں جان ڈال سکتی ہے۔''

چینی کٹر بلا (caterpillar)

پرانی طرزِ تعمیر جو ہمارے ماحول سے خاصا لگا کھاتی تھی۔ اب بوسیدہ اور دیمک زدہ تھی۔

باباجی پوتے سے آنکھیں کھول کر کہہ رہے تھے:

"یہ ہمارے بزرگوں کی نشانی تو ہے پر بہت پرانی ہو چکی ہے، بھلا ہو پتر پرویز کا وہ ایسا کٹر بلا (کیٹر پلر) چین سے لایا ہے کہ وہ تو ایک ہی وار میں ہمارے صدیوں پرانے گھروں کو بنیادوں سمیت اکھاڑ کر وہ دور پھینک دیتا ہے۔ پتر کل تو بھی تیار رہنا تجھے بھی تماشا دکھانے ساتھ لے کر جاؤں گا۔۔۔ (متفکر ہو کر) پتر! کل ہم تو نہیں ہوں گے پر شاید تجھے کچھ کچھ یاد رہ جائے۔۔۔ (آنسوؤں کا ایک شفاف بلور ان کے کھردرے گال سے یوں لڑھکتا ہی چلا گیا۔ جیسے کوئی کٹر بلا ان کی آنکھوں سے قدیم نقش بنیادوں سمیت اکھاڑ کر باہر پھینک رہا ہو۔)

سایۂ پدری

باپ کا سایہ اسے زہر تو نہیں لگتا تھا نہ اسے ماں سے کوئی ایسا عشق تھا کہ باپ کو رقیب کی نظر سے دیکھتا۔ لیکن اس نے جتنے عظیم لوگوں کی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ وہ سب کے سب یتیم تھے۔

اس کا باپ ایک بہت ہی عظیم آدمی تھا۔ وہ اسی تناور درخت کے نیچے بیٹھ کر، دادا جان کی جواں مرگی پر ماتم کرتا تھا۔

رواں دواں

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں تھی۔
گلیوں میں بچے کھیل رہے تھے۔
فضا میں پرندے اُڑ رہے تھے۔
مالی پانی دے رہا تھا۔ پودے بڑھتے جا رہے تھے۔
میں نے اندر دیکھا تھا۔ ہسپتال کے اندر دُنیا کا قیمتی ترین شخص پڑا تھا۔
اس نے پھیپھڑوں پر بہت زور دیا تھا۔ سر سے پاؤں تک کی قوتیں مجتمع کی تھیں۔
ہزاروں کام پڑے تھے۔ لاکھوں لوگوں کی قسمت رو رہی تھی۔ لگتا تھا آج دنیا، کسی خراب گھڑی کی طرح رک جائے گی۔
میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہوں۔ سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں ہے۔
گلیوں میں بچے کھیل رہے ہیں۔
فضا میں پرندے اُڑ رہے ہیں۔
مالی پانی دے رہا ہے۔ پودے بڑھتے جا رہے ہیں۔

آبائی علاقہ

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آنکھیں آنسوؤں سے اندھی ہوئیں اور لفظ حلق میں نشتر ہو گئے۔

"مجھے فخر ہے کہ۔۔۔ ف ف فخر ہے ک کہ۔۔۔ میں اس دیس کا باسی ہوں ۔۔۔ ج جہاں خوشحالی کی جگہ لاشیں آبائی علاقے میں آتی ہیں۔"

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن۔۔۔

تیل والے اور میں بے چاری

تیل والوں نے ہماری سوچ پر رنگدار پرنا ڈال کر، کالی رسی سے خوب کس دیا تھا۔
میرے ہم عمر لڑکے تو چلچلاتی گرمیوں میں بھی جیکٹ پہن کر جسم کے ریزے پسینے کے ساتھ بکھیرتے رہے۔

اب میں ڈرنے لگی ہوں۔۔۔ مرکز کا قبلہ بدل رہا ہے۔

میں سوچتی ہوں، تیل والوں نے میرا استر یوں ڈھانپا کہ ننگی صرف میری آنکھیں رہ گئیں۔ آج میرے ہاتھ پاؤں کیا سارا ملفوف جسم کھردرا ہو کر خاردار ہو گیا ہے۔

اب میں ڈرنے لگی ہوں۔۔۔ مرکز کا قبلہ بدل رہا ہے۔

میں سوچنے بیٹھی ہوں کہ اب کن امریکی یا چائینز کریموں سے میری جلد نرم و ملائم ہو کر دیکھنے اور چھونے کے قابل ہو گی۔۔۔ کیونکہ مرکز کا قبلہ تو۔۔۔

دشتِ جنوں

پتھر کوٹنے والے کیا جانیں کہ وقت کی سِل کیا ہوتی ہے؟ میں نے اپنا وقت پیس پیس کر اسے لمحہ لمحہ کیا ہے۔ خاک چھاننے والا مجنوں کیونکر اندازہ کرسکتا ہے کہ ریزہ ریزہ اکٹھا کرنا، کیا ہی مشکل ہوتا ہے۔ میں وہ ہوں جس نے صرف دشتِ نوردی نہیں کی، خود اپنا دشت تخلیق بھی کیا ہے۔ وہ دشت جس کا، ایک ایک ذرہ کئی کئی سو سال جتنا بھاری تھا۔ میں نے اس کا ہر چمکتا لمحہ لیلیٰ پر نچھاور کر دیا ہے۔

ہے کوئی داستان گو؟ ہے کوئی جو مجنوں کا طلسم توڑ سکے؟ ہے کوئی جو مجھے دریافت کرے؟

گم نام تخلیق کار اپنے ہی دشتِ جنوں میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔
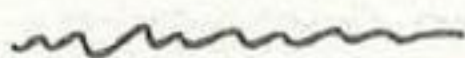
زبان کی تو۔۔۔

قبلہ نے سان، ریگ مال، پیچ کس، پانے، چابیاں نکالیں اور زبان کی اصلاح کا مصمم ارادہ کرلیا۔ قدیم لغات پر جمی گرد کی خوب خاک چھانی۔ لفظوں کے قدیم آہنی خود اور زِرہ وغیرہ کو تیل میں رگڑ رگڑ کر چمکایا۔ اکثر ناہنجار لفظوں کو (جو کھل کر سانس لے رہے تھے) پکڑ کر وہ سنائیں کہ ان کے سر ادب سے جھک گئے۔ کئی مونث لفظوں کی خوشی سے پھولی چھاتیاں دبا دیا کر، بلکہ بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر ان کی اٹھانیں سرنگوں کیں اور زِرہ میں یوں کس دیں کہ تمام لفظ اب اکڑ کر جرات مند دکھنے لگے تھے، گویا قدیم تہذیبی وقار لوٹ آیا تھا۔

زیر، زبر اور پیش سے کسی کسائی زبان دیکھ کر قبلہ کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

وہ کہاں ہے؟

ایمن بہت عجیب تھی ایک دم پاگل۔ اس نے مجھے خود بتایا تھا کہ کہیں دو لوگ بیٹھے ہوں اور وہ قریب سے گزرے اور اسے یہ شک ہو کہ وہ اسی کے بارے میں کوئی بات کریں گے، تو اسے لگتا ہے کہ وہ کہیں ان کے ہی درمیان رہ گئی ہے۔ وہیں ان دونوں میں بیٹھ کر خود پر ہنس رہی ہے۔۔۔اور جانے والی جو وہ خود ہے وہ کوئی اجنبی ہے۔ جسے وہ ان کے ساتھ جاتا ہوا دیکھ رہی ہے۔

آج میں اپنی نئی نویلی دلھن کے ساتھ اس کے سامنے سے گزر تو آیا۔۔۔لیکن تب سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ ہمارے درمیان ہی کہیں رہنے لگی ہے۔

شکر ہے یہ۔۔۔

بندری سڑک کے بیچ، میری گاڑی روک کر کھڑی تھی، اور گلے سے لگائے بچے کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔

''اسے پیدا کیا ہے تو کچھ فیصلہ کر کے جا اس کا۔'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔۔۔میں ایک بندر کا باپ کیسے ہو سکتا ہوں؟

بندری چیخی۔

''لعنت تیری مردانگی پر اسے اپنا نام دے اور میرے اور اپنے تعلق کا اعلان کر۔۔۔بس۔۔۔اب میں تیری ایک نہیں سنوں گی۔''

''اللہ! میں کہاں جاؤں؟'' میں نے حیرانی سے سٹیرنگ کو سختی سے تھام لیا۔ جیسے شدید زلزلے کے دوران تھاما جاتا ہے۔

میں نے اچانک ساتھ والی سیٹ پر دیکھا زرنش غصے میں سیٹ پر پہلو بدل رہی تھی۔ اس کا چہرہ بندری کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔۔۔اس نے مجھے غصے اور حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور گاڑی سے اتر گئی۔ زرنش نے اپنے حسن سے بھری گاڑی خالی کر دی۔

میں نے سامنے دیکھا نتھیا گلی کی خوبصورت سڑک بھی خالی تھی۔۔۔ بندری

احتجاج کر کے جا چکی تھی۔

میں نے گاڑی تیزی سے موڑ لی اور گھر کی طرف چل پڑا۔۔۔سڑک کے دونوں طرف بندر دانت دکھا دکھا کے مجھ پر ہنس رہے تھے یا غصہ کر رہے تھے۔۔۔شدید دھند میں مختلف چہرے نکل نکل کر مجھے ڈرا رہے تھے۔نتھیا گلی سے ایبٹ آباد جاتے ہوئے، میں ایک تیز موڑ مڑا۔۔۔گاڑی بے قابو ہو گئی۔۔۔بلندی سے لڑھکنا تھا کہ مجھے زرنش کی خوابیدہ آواز سنائی دی۔۔۔

"جانو کیا ہوا۔"

اگر

نفسا نفسی کا عالم تھا۔۔۔مائیں بچوں سے بے خبر تھیں۔۔۔محبّت اور نفرت کرنے والے اپنی محبّتیں اور نفرتیں بھلا چکے تھے۔روزِ محشر تھا، سورج سوا نیزے پر تھا۔فیصلے ہو رہے تھے۔

وہ کمبخت تب بھی خدا سے لڑ رہا تھا۔حالانکہ اسے جنت میں جانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔اس کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔میرا جنت میں جانا اگر ناگزیر ہے تو مجھے اذنِ کُن بھی عطا کیا جائے۔
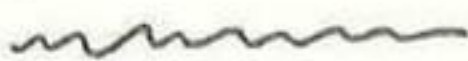
میں اور میرے کمرے میں رہنے والا

وہ مجھے نہیں مانتا ہوگا۔ میرے وجود سے انکاری ہوگا۔ میں نے بھی اسے نہیں دیکھا، بس! اک ہیولا سا محسوس کیا ہے، کسی سائے کی طرح۔

مجھے شک ہے کہ یہ ہیولا سا وہی ہے جو میرے کمرے میں رہتا ہے۔۔۔ اسے بھی شک تو ہونا چاہیے کہ کوئی ہیولا سا کمرے میں اور بھی ہے اور وہ میں ہوں۔

وہ اپنے جھوٹے یقین سے میرے وجود کی نفی کرتا ہوگا۔ میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔

میں سچا ہونے کے باوجود اس کے انکار پر مجبور ہوں کیونکہ میں اگر اس کے اثبات میں سر ہلاتا ہوں تو مجھے اپنے وجود کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔

دیکھنے میں

دیکھنے میں وہ بہت خوبصورت ہے۔ پھر تم نے اسے چھوڑ کیوں دیا؟

صرف اسے دیکھ کر تو، میں زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔

کیا مطلب؟

مطلب وہ، برتنے میں کچھ زیادہ چمکتی نہیں تھی۔ وہ زندگی کی طرح، بورسی تھی۔ وہ بارش کی طرح بھگو نہیں سکتی تھی۔ بس! پسینے جیسی چپچپاتی رہتی تھی۔ صرف دیکھنے میں جلتی ہوئی آگ جیسی تھی۔ اس کے حضور سجدے بھینٹ نہیں چڑھائے جا سکتے تھے۔

صرف دیکھ کر تو زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔

کھنڈرات میں

اس نے اپنی خوبصورت ہتھیلی پر ایک چھلنی ہوئی ٹیڑھی پسلی اس طرح رکھی کہ توازن بگڑنے نہ پائے اور بولی، ''یہ کسی مرد کے سینے کی ہڈی لگتی ہے۔ کیسا تنومند ہوگا۔ اپنی طاقت پر کیسے اتراتا ہوگا۔ اکڑ کر چلتا ہوگا۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا ان میں مجھے ایک ہیرو کی تصویر نظر آئی۔

میں نے جل کر اس کی ہتھیلی کے نیچے اپنی ہتھیلی رکھی اور توازن بگاڑ دیا۔ پسلی کانپنے لگی میں نے کہا، ''یہ تو کسی عورت کی پسلی لگتی ہے۔ بہت جاندار ہوگی۔ مامتا سے لبریز۔'' اس نے میرا ہاتھ جھٹک کر اس زور سے پسلی زمیں پر پھینکی کہ۔۔۔ ہمارے حسد سے تہذیب کے ریزے ایک بار پھر تہ خاک چلے گئے۔

میرا تخیّل شیئر کرو بس!

"دوسروں کے لکھے گئے اکثر تجربے زمینی حقائق سے مختلف ہوتے ہیں۔"

میرا جملہ سن کر اس نے منہ پھیر لیا۔

"دیکھو! لائبریری کے روشندان سے باہر کا نور اندر نہیں لایا جا سکتا۔ نہ ہم لائبریری کا اندھیرا، باہر انڈیل سکتے ہیں۔"

وہ سُنی ان سُنی کر گئی۔

"میرے خیالات، میرا تخیّل ہی میری جنت ہے اور بس!"

اس بار وہ شیطان کو لے کر جنت سے کود گئی۔
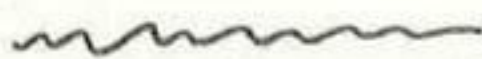
پرندے میں جان

اُڑتے پرندے کے پَر کیسے گنے جاسکتے ہیں؟ کون ہے جو انھیں گن سکتا ہے؟

کیوں تم ایسا کہتے ہو؟ اس سے پرندے ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ سیارہ چھوڑ گئے تو۔۔۔

تو یاد رکھنا، زمین پر اکیلے تم بھی نہ رہ سکو گے۔ ہماری جان بھی ان پرندوں میں ہے، جیسے

داستان کے جن کی جان طوطے میں تھی۔

اور اگر انھیں غصہ آ گیا تو یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر بار خدائی حکم کے ہی منتظر

رہیں۔

میری بات ابھی مکمّل نہیں ہوئی تھی کہ وہ چیخا (جو پَر گننے کا دعویٰ کرتا تھا) بھاگو

بھاگو، ابابیلوں کے پنجوں اور چونچوں میں کنکّر ہیں۔۔۔ بھاگو۔

ہمارے مطابق

الف، فطرت کے خلاف کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ وہ سکھ، چین اور لذت کو دانش مندی سمجھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اکٹھے رہتے ہیں۔

ب، کچھ وقت مراقبہ کر کے، غریبوں کی مدد کر کے، دیوتاؤں کی تسکین کا باعث بنتی ہے۔ راضی برضا میں عافیت جانتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اکٹھے رہ رہے ہیں۔

لیکن ہم یہ سب کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔۔۔

ان دونوں کا کچھ کرنا پڑے گا۔

مردوں کا معاشرہ

کاش! میں پوری بات سن سکتا۔

ایک آزاد مرد اور ایک آزاد عورت کیفے میں بیٹھے جھگڑ رہے تھے۔۔۔ میرا ویٹر ہونا مجھے یہ حق دیتا تھا کہ میں ان کے قریب جا سکتا تھا۔۔۔ عورت کہتی تھی جنت میں ہمارا کیا ہے؟ حوریں، غلمان، نہریں اور سب باغ وغیرہ تمھارے لیے ہیں۔ یہاں بھی چار چار عورتوں کا حق تمھارے پاس ہے۔

میں یہاں ایسی باتیں تقریباً روز سنتا تھا۔ لیکن وہ آزاد مرد کچھ نیا کہہ رہا تھا۔ وہ مسلسل ایک بات پر زور دے رہا تھا کہ جنت تم عورتوں نے بنائی ہے۔ جنت کی بینی فشری تم ہو۔۔۔ جنت میں جانے کی خواہش نے مرد سے کیا کیا کام نہیں لیے؟ یہ تمھاری تخلیق ہے۔ جس سے تم نے اس منہ زور بے وقوف کو نکیل ڈال رکھی ہے۔ جو بھی ہو مرد جنت تخلیق نہیں کر سکتا، اگر وہ تخلیق کرتا تو تمھارا حق ضرور رکھتا۔۔۔

کاش! میں اس کی کچھ اور دلیلیں بھی سن سکتا۔

رضامندی

مہربان: کہاں ہے مریض؟

مجبور: وہ اندر ہیں۔۔۔لیکن، میں، یہ، پوچھنا۔۔۔

مہربان: جی جی مجھے پتا ہے۔ میں سمجھ گیا۔ میں آپ کے ابا جی کی موت کا پورا ایک لاکھ لوں گا۔

مجبور: آاا۔۔۔اتنے۔۔۔وہ۔۔۔

مہربان: جی میں کوئی اجرتی قاتل نہیں ہوں کہ ایک ہی گولی سے سب آر پار۔۔۔مجھے انھیں تیار کرنا ہوگا۔ ان کی مرضی اور موڈ بنانا ہوگا۔ وہ بیمار ضرور ہیں لیکن دیکھیں مرنا کوئی نہیں چاہتا۔ اور آپ دیکھیں آپ اپنے پیارے باپ کے تڑپنے کی اذیت سے کتنے پریشان ہیں بلکہ ایسے مریض کو دیکھ دیکھ کر تو پورا گھر نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ دنیا کے سارے کام رک جاتے ہیں۔ ویسے میں نے دیکھا ہے کہ کئی مہینے بلکہ کئی سال تک لوگ مریض کے مرنے کی دل ہی دل میں دعائیں کرتے ہیں۔ آپ نے بھی سنا ہوگا ہر کوئی یہ کہتا پھرتا ہے۔ اللہ آسانی پیدا کرے۔ ہاہاہاہا۔۔۔پھر میرے کام کا فائدہ یہ ہے کہ آپ کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں رہتا۔ بعض لوگ قتل کے مقدمے سے بچ جاتے ہیں۔ ہزار رنگ کے لوگ ہوتے ہیں نا، جی۔۔۔

مجبور: اچھا اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔

مہربان: پہلے ۲۵ فیصد ایڈوانس مجھے دے دیں۔

مجبور: یہ لیں۔۔۔ گن لیں۔

مہربان: سمجھو گن لیے۔۔۔ مجھے کبھی کسی نے کم پیسے نہیں دیے۔ ہاں یہ بتائیے مجھے وقت کتنا دیں گے آپ۔

مجبور: ایک ہفتہ ہے آپ کے پاس۔ (سوچتے ہوئے) سات دن یہ اور چالیس دن آگے۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے چہلم کے بعد ہمیں باہر جانا ہے۔ بس سات دن۔

تیسرے دن، تیسری ملاقات۔۔۔

دنیا کا اصل باسی اندھیرا ہی تو ہے۔ اسے سچ جانو یا اسے رب مانو، یہی نور کا آخری درجہ ہے۔ اس سے وابستہ ہے گھنگھور سناٹا، خوبصورت بادلوں کی طرح چھایا ہوا، سناٹا۔ چپ اور ایک گہرا ہو کا عالم۔ یہی ہے مکتی۔۔۔ یہی ہے مکتی کے متلاشی کی جائے پناہ۔۔۔ یعنی فنا۔۔۔ باقی سب فریب، دھوکے کا آسیب۔۔۔ زمین ماں کی طرح بانہیں پھیلائے آپ کی منتظر ہے۔ آئیں میں آپ کو موت کی نرم گود میں سلا دوں۔ یہاں اذیت ہے۔ کینسر کا نہ ختم ہونے والا عذاب۔۔۔ وہاں، باغ، نہریں، حوریں اور آپ کی نہ ختم ہونے والی جوانی۔۔۔ ہر درد سے نجات۔۔۔ کینسر سے کتنی شدید تکلیف میں ہیں آپ۔۔۔ وہاں جہاں کوئی تکلیف نہیں۔۔۔ ایک دم سکون۔۔۔ چلیں گے میرے ساتھ۔۔۔ بابا جی نے مرسی کلنگ قبول کر لی۔

چلو

خیر! کوئی بات نہیں۔ درخت، آری سے آنے والی شرشر سنتا رہا۔

خیر! کوئی بات نہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی سے آئے ہوئے مہمان نے کہا۔

چھ بچے چھوڑ کر آشنا کے ساتھ بھاگتی ایک ماں کی ممتا کو دیکھ کر۔ اس کے سرد شوہر نے کہا، خیر! کوئی بات نہیں۔

ہارے جواری، الیکشن میں شکست خوردہ لیڈر، بوڑھی ہیروئن، شیر کے پنجوں میں پھنسی ہرنی، تازہ دم شیروں میں گھرے شیر۔۔۔

ہر ہر طرف، خود سن لو ایک ہاری ہوئی آواز جس میں امید پوشیدہ ہے۔ چلو، خیر! کوئی بات نہیں۔

اب بتا! کیا تو نے واقعی فیصلہ کر لیا ہے؟

ہاں میرا فیصلہ اٹل ہے۔

اگر تیرا یہی فیصلہ ہے تو چلو، خیر۔۔۔
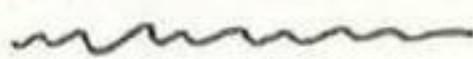
عہدِ نو

سوچو! میری جان! جب یہ عہد نہیں رہے گا۔ منوں مٹی تلے ہمارا جسم فنا کی نیند سو جائے گا۔ جب تمام جزئیات، کُل میں دفن ہو جائیں گی۔ جب ہمارا رسم الخط آڑی ترچھی لکیروں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ جب ہماری سائنس، متھ بن چکی ہوگی۔ تب پتھر ہوئے نیم خوردہ اوراق پڑھ کر۔ اس عہد کے ماہرین ہماری کہانی کی کیا تفہیم کریں گے؟ ہوسکتا ہے تب تم واقعی دیوی بن چکی ہو۔

پھول؟؟

پھول بھونرے کے پیچھے کبھی نہیں بھاگتا، لیکن کلی بھونرے کو دیکھ کر بے کل ضرور رہتی ہے۔

اُس پھول کو شاید پارہ ملا پانی دیا گیا تھا۔ شاید کسی سرمایادار کی فیکٹری کی کثافتیں اسے پاگل کر گئی تھیں۔ اس کی نفسیات میں کوئی کیمیکل ری ایکشن، نام نہاد قدروں سے اسے متصادم کر گیا تھا۔ وہ پھول بھونرا اُڑنے لگا تھا۔ زردانے بھونرے نے لے کر جانے تھے۔ وہ خود زردانوں کی پھوار برساتا تھا۔۔۔ بھونرا بھوں بھوں اڑتا تھا۔

میں اس معصوم، مجبور پھول پر نوحہ کناں ہوں۔ خوش ہوں کہ اس کے قتل کو نام تو ڈھنگ کا دیا گیا ہے۔ کم از کم وہ کسی بے غیرتی کے نام پر تو قتل نہیں ہوا۔

شام کا خوف

مجھے آج بھی گاؤں کی شام اداس کر دیتی ہے۔ سائے قد سے بڑھنے کا عمل بہت خوف ناک ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سورج کبھی نہیں ڈوبتا۔ مجھے پتا ہے کہ صبح وہ کون سے منٹ کے، کس سیکنڈ میں، کس چوٹی سے نمودار ہوگا۔ اب دشمن قبیلے کہاں رہے۔ اب جنگلی جانور چڑیا گھر میں رہتے ہیں۔ ان سے خوف کھانے کا کوئی جواز بھی نہیں ہے۔ اب نہ غار ہیں جن میں ہم پناہ لیں نہ ان غاروں میں خونی چمگادڑوں کا بسیرا، ہمارے قرب و جوار میں ہے۔ نہ جن نہ چڑیلیں نہ آسیب۔

۔۔۔ پھر بھی اندھیرے کی آمد۔۔۔

وہ۔۔۔ وہ دیکھو! وہ۔۔۔ ابھی ابھی ایک خونی چمگادڑ ادھر سے گزری ہے۔

آؤ

آؤ! پھر سے ہاتھ پکڑ کر بارش میں بھیگیں گے۔ یہ میری ایک دیرینہ خواہش ہے۔
وہ آئی اور ہم بارش کا انتظار کرتے رہے۔ روزانہ ہم ایف ۹ پارک میں آسمان تکنے آتے تھے۔ وہ ناشتہ بنا کر لاتی۔ ایک دن آسمان مہربان ہو گیا۔ میرے دائیں ہاتھ میں اس کا بایاں ہاتھ تھا۔ مجھے یاد ہے۔ تیز ہوا میں بھیگے پتے بوجھل ہو کر زمین پر رقص کرتے، فضا میں بادلوں کے گھن چکر، ایک ٹیکسی والے کا، رک کر دیکھنا۔

ایک موٹر سائیکل سوار کا گر کر زخمی ہونا۔

پرندوں کا ہوا میں توازن برقرار رکھتے ہوئے محفوظ مقام ڈھونڈنا۔

ہمیں اس دن اتنا مزہ آیا کہ شاید ہی دنیا میں کسی نے وہ مزہ اس سے پہلے یا بعد میں چکھا ہو۔ ہماری گیلی ہتھیلیوں پر آج بھی وہ لمس وہ ذائقہ قسمت کی طرح نقش ہے۔

اس کے بعد جب بھی بارش ہوئی ہم دونوں دفتری فرائض اور ملازماتی ذمہ داریاں تیاگ کر ایف ۹ پارک آتے رہے۔ ہتھیلیاں جڑتی رہیں۔

ہم بھیگتے رہے۔ پر وہ لطف کبھی نہیں آیا۔ کیا اس سارے میں ان پتوں کا رقص نہیں تھا جو اس دن ہمارے اردگرد جاری رہا تھا۔

وہ ٹیکسی والا

وہ پرندوں کا اسی طرح وزن برقرار رکھتے ہوئے محفوظ ٹھکانے ڈھونڈنا۔۔۔
نہیں تھا۔

اس دن کی لذت میں صرف ہم دونوں کی موجودگی شاید لازمی نہیں تھی۔
مجھے یقین ہے۔ پورا ماحول اسی طرح اسی جزئیات اسی ترتیب کے ساتھ اگر
دوبارہ ہوا تو ہم تب لطف اُٹھا سکیں گے۔
صرف میں، تم اور بارش یا، دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کا بائیں ہاتھ میں ہونا شاید کافی
نہیں ہے۔

موت پر

وہ دیوانہ پتا نہیں کیا کیا سوچتا تھا اور اونچی آواز میں خود کلامی کرتا رہتا تھا۔ مجھے تو کبھی کچھ سمجھ نہیں آیا۔

یہ لو! خود ہی سن لو۔

میں نے ماتم کرنا ہے۔ مجھے زنجیر لا کر دو۔ میرے لیے انگاروں کا راستہ بناؤ۔ میں ان معصوم شہیدوں کے غم میں ہلکان ہو رہا ہوں۔ میں نے اپنا خون اور اپنے زخم نذر کرنے ہیں۔ ان معصوم شہید لمحوں کے حضور، جو ماضی کے تار میں جڑے ہوئے تو ہیں، پر ہمارے حافظے سے محو ہو گئے ہیں۔
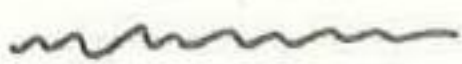
ہزار سال پُرانا قتل

وہ، ہزاروں سال بعد آنے والے مؤرخ سے مخاطب ہو کر، فضاؤں میں اپنا بیان ریکارڈ کروا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ فضا اس کا بیان سنبھال کر رکھے گی۔

''مجھے افسوس ہے۔ اے کئی ہزار سال بعد آنے والے مؤرخ میں شرمندہ ہوں ۔۔۔ ہزار سال پرانے واقعے پر جو آج تک ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔۔۔ ہمارا غم بہت بہت پرانا ہو گیا ہے۔ اتنے عرصے بعد بھی ہمیں کوئی نیا غم نصیب نہیں ہو سکا۔ افسوس! صد افسوس۔۔۔

میں اتنا پرانا غم نہیں منا سکتا۔

مؤرخ مجھے ان سب میں مت گننا۔''

ہم سب بچے اسے، ''پاگل ائی اوئے۔۔۔ پاگل ائی اوئے۔۔۔'' کہہ کر پتھر مارتے تھے۔ ہمارے بڑے اپنی اپنی دکانوں میں بیٹھے یوں دانت نکالتے تھے جیسے سفید دانتوں کی لڑی برائے فروخت ہو۔۔۔ اس کے جوتے لہو سے بھر گئے تھے۔

روزگار

روزگار نہ ملنے کا غم، روزگار میسر آجانے والے دکھ سے کہیں بڑا ہے۔
نارسائی سے لذت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ جس کی آبیاری تخیّل سے کسی بچ کی طرح کومل راہیں بناتی ہے۔
وہ کولہو کا بیل آنکھوں پر نوٹوں کی پٹی باندھے، سوچ رہا تھا۔

نا دُکھ

میں نے اسے اتنا اداس کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آج وہ دکھ کا مکمل مجسمہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر تسلی بھرا ہاتھ رکھا۔ وہ کچھ بھی بتانے سے قاصر تھا۔

میں نے اس کے لیے ماحول کو ایسا کر دیا کہ اس کے ہونٹوں کو کچھ کچھ آزادی کا احساس ہونے لگا۔ نمرہ اسے چھوڑ گئی تھی۔ اسے نمرہ کے جانے کا دکھ نہیں بھی تھا اور تھا بھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے ساون کی دوپہر میں برستے بادل تلے وہ سورج کی چلچلاتی بارش میں کھڑا ہو۔ دکھ یا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ پر اس کی کیفیت بہت عجیب تھی۔

نمرہ نے اس کی اچھی اور قیمتی یادوں کو گدلا کر دیا تھا، جن میں نمرہ صرف اسی کی ہوتی تھی۔۔۔ اور بری یادوں میں تفاخر کے بہت سے پہلو اُجاگر کر دیے تھے۔ جن میں رقیبوں کی قطاریں تھیں، لیکن ان میں سب سے نمایاں خالد ہی ہوتا تھا۔۔۔

اُسے سوچنے سے خالد کو عجیب الجھن ہوتی تھی۔ خوشی اور غم کی ملی جلی بے ہنگم کیفیت تھی۔ کچھ نا عورت یا نا مرد جیسی۔

جیسے ہم نے ہیجڑوں کو بطور سالم انسان قبول نہیں کیا۔

بالکل ایسے ہی اسے یہ "نا دکھ" بہت دکھیا کر گیا تھا۔

سائے کی تصویریں

تو مجھے کیوں ہمیشہ اپنے سائے کی تصویریں بھیجتی رہی؟

میں کیوں نہ سمجھ سکا کہ تو کیا کہنا چاہتی ہے؟

میں کیوں نہ جان سکا کہ سایہ درخت ہے بھی اور نہیں بھی؟ وہ ایسا دکھتا ہے کہ ہم درخت کی شکل پہچان لیتے ہیں، پر سائے سے پھل نہیں توڑ سکتے۔ ایندھن کے لیے کوئی ڈالی نہیں مانگ سکتے۔ جھیل کا عکس دنیا دونی ضرور کر دیتا ہے پر ہم اس دنیا میں جا نہیں سکتے۔ وہاں سانس نہیں لے سکتے۔ وہاں کے چاند تارے نہیں توڑ سکتے۔

میں کیوں تمھارے سائے کی تصویریں اکٹھی کر کے خوش ہوتا رہا۔۔ آخر کیوں۔

نُفیل

(ایک عرب سردار، نُفیل جو ابرہہ سے جنگ ہار کر اس کا بدرقہ بن گیا تھا اور ابرہہ کی فوج کو مکہ تک لے آیا تھا۔)

رُدَینہ! کاش تو دیکھتی اور تو ہرگز نہ دیکھ سکے گی کہ میں آج پھر سے صحرا میں دشمنوں کو کعبے کا راستہ دکھا رہا ہوں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہاتھی کی رفتار سے چل رہا ہوں اور تو یہ کیسے جان سکتی ہے کہ صحرا میں ہاتھی کی رفتار کیا ہوتی ہے؟ رُدَینہ! اب کہ ابرہہ اپنی ہی ابابیلوں کے سائے تلے مکمل عزم کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کعبے کے بتوں اور دیواروں کی تباہی ہماری راہ دیکھتی ہے۔

رُدَینہ! میں ابرہہ کے داؤ سے واقف ہوں لیکن رب کعبہ کے پیچ نہیں جانتا۔۔۔

رُدَینہ! افسوس صد افسوس، میرا مالک، ایک ہارے ہوئے سردار کے مسائل نہیں سمجھ سکتا۔

سو میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ۔۔۔

ایک خط

تو کیوں میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں تجھ سے دور بھاگنا چاہتی ہوں۔۔۔
اب اگر تو سچ سننا چاہتا ہے۔۔۔ تو لکھ دیتی ہوں یقیناً تو میرا مسئلہ سمجھ جائے گا۔

ہماری قربت رہی لیکن تو مجھے پسند نہیں آیا۔۔۔ تو دیکھنے میں خوبصورت ہے۔
چھونے میں جو مردانہ سختی ہوتی ہے وہ تجھ میں بہت بھلی ہے۔۔۔ لیکن مجھے تیرے پسینے کی بو نہیں پسند، جو تیرے جسم پر جلد کی طرح منڈھی ہوئی ہے۔ تو میرے نتھنوں کے لیے ایلین ہے۔ دیکھ چکھنے کی بھی ایک جمالیات ہوتی ہے۔ تیرا ذائقہ میرے لیے بدذائقہ ہے۔ میں لاکھ کوشش کرلوں تجھے محسوس نہیں کرسکتی۔

فطرت نے ہمیں ایسا بنایا ہے کہ صرف ہمارا مجبوری کا رشتہ بن سکتا ہے۔ پلیز آئندہ۔۔۔

مرنے والوں سے معذرت

(۱)

خون کے لوتھڑوں سے فضا چھلنی تھی۔ معدے اور آنتوں کے بھبکے نتھنوں پر بار ہوئے جاتے تھے۔

دشمن کون ہے؟

ہم چیخ رہے تھے بتاؤ دشمن کون ہے۔ اس کا دھڑ تو خلیہ خلیہ ہو کر ہمارے لوتھڑوں میں مل چکا ہے۔ اب شناخت کا ہر ٹیسٹ اچھی اور بری نسلیں پہچاننے سے قاصر ہے۔ ہم کیا کریں؟ ۔۔۔ تو ۔۔۔ تو کیا وہ بھی ''ہم'' ہی تھا۔ ہم جیسا۔ کیا ہم خود اپنے دشمن ہو گئے ہیں؟

(۲)

شہیدو میری معذرت قبول کرنا۔ آخر آنسو، پانی سے ہی تو بنتے ہیں۔ ایک جسم میں کتنا پانی ہوتا ہے۔ اور اس پانی میں سے آنکھیں کتنے آنسو بہا سکتی ہیں۔

میرا جسم اتنے آنسو نہیں بنا سکتا۔ جتنی لاشیں میرے سامنے بکھری پڑی ہیں۔ آخر لاشوں کا حق ہوتا ہے کہ ان پر رویا جائے۔ اب ایک لاش کے حصے میں آدھا آنسو ۔۔۔ میں کیسے رو سکتا ہوں۔

مرنے والو، میرا جسم اتنے آنسو نہیں بنا سکتا ۔۔۔

مرنے والو، میری آنکھیں اتنے آنسو نہیں بہا سکتیں ۔۔۔ میں تمھاری توہین نہیں کر سکتا۔

بوند

بوندا باندی سے خشک زمین کی پیاس کیسے بجھ سکتی ہے۔ وہ جل تھل ہو کر شاداب ہونا چاہتی تھی۔

اپنی کوکھ میں چھپی زرخیزی کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔۔۔

وہ بے وفا ہو گئی۔

سنگوارہ

لوگ چوٹی سے دھواں دیکھ کر علاقہ خالی کر گئے تھے۔ انھوں نے اسے بھی بہت سمجھایا تھا کہ بوریا بستر باندھ لو۔ پر وہ نہ مانا تھا۔ لوگ اسے عقل سے پیدل سمجھتے تھے۔ وہ شاید دھوئیں سے لاوے کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا یا وہ کچھ اور ہی سوچتا تھا۔

آج ہزاروں سال بعد ہم اس کے فیصلے پر، اسے داد پیش کرتے ہیں۔۔۔ اس کے ساتھ والے کب کے رزقِ خاک ہو کر مٹی ہو گئے، لیکن وہ گمنامی کو شکست دے کر، آج بھی دنیا کے سامنے کسی چٹان کی طرح زندہ کھڑا ہے۔

گلوبل وارمنگ

سخت سے سخت آہن کو دھیرے دھیرے، نرم نرم پوروں کے لطیف سہلاوے سے
یوں پانی پانی کرتا تھا کہ الاماں۔۔۔

وہ پتھر کو موم بنانے کا فن جانتا تھا۔۔۔

لیکن گلوبل وارمنگ کی وجہ سے، اب موم کی گڑیا کو زیادہ دیر سنبھال کر رکھنا اس
کے بس میں نہیں رہا تھا۔

دیوتا

چلو کچھ دیر جی لیتے ہیں۔ دونوں نے دیوتا کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور خود کو رنگوں اور خوشبوؤں سے بھر لیا۔۔۔

حیرت مجھے دیوتا پر تھی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

ایک تنکے کی کسر

گھونسلا بننے میں بس ایک تنکے کی کسر رہ گئی تھی۔ جب چڑیا شِکرے کی نوکیلی چونچ کی زد میں آئی تھی، بس ایک تنکا کم تھا۔ انڈے اس کے پیٹ میں بننے پر آمادہ تھے۔ وہ ہمہ تن مائل بہ زِتھی۔

شِکرا، یہ کبھی نہیں جان سکتا کہ وہ ایک نسل کے لیے، ایک برادری کے لیے، ایک علاقے کے لیے۔۔۔ ایک المیہ داستان اپنی نوکیلی چونچ سے تحریر کر گیا ہے۔ المیہ تحریر کرنا کتنا آسان ہے۔ یہ تو کوئی شِکرے سے پوچھے۔

جنسی سفاک

پہلا: حرامزادہ، کتے کی نسل، سور کی اولاد ہے، اسے بیچ چوراہے لٹکا دو۔

دوسرا: اسے وہ اذیت دے کر مارو کہ اس کی چیخیں سن کر جرم کرنے والے کانپ اٹھیں۔

تیسرا: اس ماں کے۔۔۔ کو سنگسار کر دو۔

چوتھا: سرِ عام زندہ کھال کھنچواؤ اس بے غیرت کی۔

پانچواں: ہاں ہاں! اتنا تڑپاؤ اتنا تڑپاؤ کہ موت مانگے لیکن موت اس سے پناہ مانگتی پھرے۔

آخری: (سوچتے ہوئے) پتا نہیں کیوں قدرت نے اس ظالم کی سفاکی میں لذت کے شفاف چشمے رکھ دیے تھے۔

کائنات

ایک سیلن زدہ تاریک کمرہ میری کل کائنات ہے، ٹوٹے فرش پر بچھی بوسیدہ چٹائی میری پسلیوں کے نقش خود پر پرنٹ کر چکی ہے۔ میں آہنی مقفل دروازے کی مہین سی درز سے، کائنات کے سربستہ راز جاننے کا دعویٰ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن مجھ پر کھلی کشادہ فضاؤں میں اڑنے والے وہ پرندے ہنستے ہیں جو بے کراں فضاؤں سے خوراک تلاش کرنے کے لیے ہمیشہ زمین کے گٹر میں گھورتے رہے۔ انھیں کائنات کی وسعت نے کبھی حیرت میں نہیں ڈالا۔

اچھا انسان

شریف آدمی: اس سے پوچھ لینے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔

برا آدمی: حرج ہے۔

شریف آدمی: نہیں ہے۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا، تم پوچھ لو۔

برا آدمی: اگر اس کی زبان سے انکار چپک گیا تو۔۔۔؟

شریف آدمی: تو۔۔۔اور بہت ہیں۔

برا آدمی: کوئی اور۔۔۔؟

شریف آدمی: ہمیں تو جسم چاہیے۔۔۔ہاہاہا۔۔۔بس جمہوری طریقے سے۔

آف کیمرہ

''یہ عظیم لوگ ایسے ہوتے ہیں؟؟''

''بس! رہنے دے!!''

پنجرہ

میں دیکھتا رہا تھا۔

میں جانتا تھا۔

واحد میں ہی تھا جو جان سکتا تھا۔ میں اس پرندے کے ساتھ رہ رہ کر مثلِ سلیمان اس کی زبان جان چکا تھا۔ جب وہ بند پنجرے کی سلاخوں میں اپنی اولاد کو زندگی کے گر سکھا رہا تھا۔ پَر کیسے پھڑ پھڑائے جاتے ہیں۔ تیز، منہ زور ہواؤں میں پَر کھول کر کیسے توازن قائم کیا جاتا ہے۔ شکار کیسے کرنا ہے، کیسے شکاری سے بچنا ہے۔ اپنی اُس اولاد کو جس کی پیدائش وہ اپنا سب سے بڑا جرم سمجھتا تھا۔

اس خوش الحان پرندے کی چونچ، نصیحت کے وقت، لکنت سے کیونکر بھر گئی تھی۔ یہ میں جانتا تھا۔۔۔ یقیناً یہ میں ہی تو جان سکتا ہوں۔

کشادگی

نیلم کے اجلے ملبوس کی چمک ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے جسم کی مہک کھڑکیوں کی درزوں سے کہیں گم ہوگئی یعنی خوشبو بھی نیلم کی مانند صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ کمرے میں لٹکا نیلم کا لباس کسی دکان پر لٹکے سوٹ جیسا پھیکا ہوگیا۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اس ملبوس نے نہ تو کبھی کسی بدن کے مساموں کے لب چھوئے ہیں نہ ملائم روئیں کی نوکیں اس کے تانے بانے میں الجھی ہیں۔

رفتہ رفتہ ویرانی نے گھر کے مالک کی تنگ دلی میں خوب کشادگی پیدا کردی۔ اس کیفیت نے وہ فضا تخلیق کی کہ کمرے میں آتے ہی محسوس ہوتا تھا کہ سوٹ نے خاصی جگہ گھیر رکھی ہے۔ کمرہ تنگ اور تاریک دکھنے لگا ہے۔۔۔ پھر سوٹ ٹرنک میں کیا گیا گویا ماضی کی یادیں بھی، سلیقے سے سمٹ کر صندوق کے کونے میں دبک کر دم توڑ گئیں۔

سوٹ کے اُٹھ جانے سے کمرا کشادہ ہوکر خوابوں سے بھر گیا۔ تازہ خوشبو کی مہک جان لیوا حد تک خوش کن تھی۔ زندگی کی نئی صبح اپنے ساتھ تازگی تو لے کر آتی ہے۔ سو، لے کر آئی۔

نئی دلھن کا نیا سوٹ ان چھوئے مساموں اور روئیں کی لطیف چبھن سے جھلمل جھلمل کرکے کمرے کی کشادگی میں خوب اضافہ کر رہا تھا۔

اندر کون ہے؟

وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔ جی میں اکرم کی طرف گیا وہ گھر پر نہیں تھا کہیں گیا ہوا تھا۔ پوچھنے والے نے کہا۔ تجھے کس نے بتایا کہ اندر کوئی نہیں تھا۔ بتانے والا پھر بولا۔ جی ان کے گھر پر اتنا بڑا تالا پڑا تھا۔ پوچھنے والا چلایا۔ یہ کہاں لکھا ہے کہ دروازے پر تالا ہو تو اندر کوئی نہیں ہوتا۔

بھرتی کے۔۔۔

''مجھے اندھیرا اتنا پسند ہے جتنی کہ تم۔۔۔ تمھارے ساتھ جیسے میں ساری فکروں، سے، لایعنیت سے، آزاد ہو جاتا ہوں۔۔۔ بالکل اسی طرح اندھیرے سے لبریز کمرے میں مجھے راحت ملتی ہے۔

لیکن یہ اندھیرا ایسا کمبخت ہے جب سردی اور کیچڑ سے مل جاتا ہے تو بہت ڈراؤنا ہو جاتا ہے۔''

تم بھی نا۔۔۔ بہت پاگل ہو۔۔ اب سگریٹ پیو تو دھواں نہ ہو۔۔۔ بارش ہو اور کیچڑ نہ ہو۔۔۔ اندھیرا ہو تو یہ نہ ہو۔۔۔ میں ہوں تو فلاں نہ ہو۔۔۔ تم چیزوں کو ان کی مکمل حالت میں قبول کر کے انجوائے کیوں نہیں کرتے۔

ہاہاہا میں شاعر ہوں افسانہ نگار ہوں۔۔۔ اضافی اور بھرتی کی چیزیں کیسے برداشت کروں۔۔۔ تمھارے، بال، گال، ہونٹ میرے ہیں۔ یہ سرخی کریمیں تو کسی کمپنی بہادر کی ہیں۔۔۔ اضافی اور بھرتی۔۔۔ ہاہاہا۔

یہ کیا ہے؟

وہ رشتہ جو ایک مرد اور عورت کے درمیان ہوتا ہے میں نبھا چکا۔ میں مدتوں پہلے تیرے حلقوم سے نکلے، فضا کی چنٹوں میں پوشیدہ، وہ الفاظ بھی چن کر ذخیرہ کر چکا، جو میرے لیے نہیں تھے۔

میں تیرے ساتھ رقص کرتے، تیرے خلیوں میں پانی کا چھلکنا سن چکا۔ میں تجھے اتنا سوچ چکا ہوں کہ اب مجھے قے آنے لگی ہے۔۔۔ لیکن تم نے کبھی مجھ پر توجہ نہ دی، چلو خیر اب میں کیا کہوں، میرا نصیب۔۔۔ میں ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔

شہزادی نے آج پہلی بار اسے جاتے جاتے غور سے دیکھا، تو اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئی۔ وہ تو لوٹ کر نہ آیا لیکن شنید ہے کہ شہزادی نے اس کے فراق میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

گناہ ایک۔ ثواب دس

راستے سے گزرنا محال ہو گیا تھا۔ لوگ اس نیک شخص کو بہت گالیاں بکتے اور برا بھلا کہتے تھے۔ لیکن وہ ثواب کمانے کی دھن میں مست تھا۔ معاملہ اس کا اور اس کے خدا کا تھا۔ سو چمکتی نوک والے کانٹے، آباد راستے میں پھینکتا اور کچھ دیر بعد راستہ صاف کر دیتا تھا۔

وہ ہر بار یہ عمل دھرا کر، نیکی کے رجسٹر میں نو (۹) لکھتا اور معصومیت سے آسمان کو دیکھ کر مسکراتا تھا۔

ضروری تو نہیں کہ ہر بار۔۔۔

''نیکو کاروں کو سزا ملتی ہے۔۔۔تم اس کی مدد نہ کرو۔''

(وہ سنگ دل سختی سے بولا)

''ہاہاہا یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

(میں نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی)

''ہاں ہاں! یہ لازم ہے کہ انھیں سزا ملے جو دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔۔۔دریا پار کرنے کی سکت اس بڈھے سے خود قدرت نے چھینی ہے۔میں نے یا تم نے نہیں۔۔۔اسے دفع کرو اور چلو۔''

(وہ دریا میں اتر گیا)

''میں اس بزرگ کی مدد کر کے رہوں گا۔تُو جو جی میں آئے کر۔'' (میں نے دو ٹوک فیصلہ سنایا اور پیر تسمہ پا کو کندھوں پر اُٹھا لیا)

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دریا کے اس پار پہنچ کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''تُو ٹھیک کہتا تھا۔۔۔اب میری مدد کر۔۔۔دیکھ یہ نیکی میرے گلے پڑ گئی ہے۔''

(میں اس خبیث کو پکارتا رہا لیکن وہ تو جیسے بالکل بہرا ہو گیا تھا۔)

مُردار خور

''اے جادوگر! تمھارے جادو سے اس خبیث کو کیا ہو سکتا ہے؟''

''لڑکی! میرے قریب آؤ اتنا قریب کہ میرے دل کی دھڑکن تمھیں ڈھول کی طرح سنائی دینے لگے۔۔۔ پھر تم جو چاہو گی اسے میں وہی بنا دوں گا۔

(جب دھڑکن ڈھول بن گئی اور سانسیں شہنائی تو جادوگر نے ہونٹ، کانوں سے جوڑتے ہوئے سرگوشی کی) بولو! اسے کیا بنانا چاہتی ہو گدھا، کتا یا بیل۔۔۔ بولو۔۔۔ بولو نا!!!''

لڑکی کی سرخ ہوتی آنکھوں کے سامنے گدھ کی بالوں بغیر گردن گھوم گئی، جو مردار کے پیٹ کے شگاف میں اندر تک گھس کر پسلیوں کے پنجرے سے دل نکال لاتی ہے۔ تیز گرم سانسوں کے ساتھ اس کے منہ سے نکلا۔۔۔ ''گدھ۔۔۔ ہاں ہاں اس برف کی سِل کو گدھ بنا ڈالو۔ تاکہ اسے نوچنا آجائے۔''

جادوگر کچھ الٹا سیدھا پڑھ کر چلایا، ''بن جا!!!!۔۔۔ گدھ۔۔۔''

لڑکی کو محسوس ہوا جیسے وہ جیتی جاگتی لاش کی طرح بے سدھ پڑی ہے۔ پیٹ میں اندر تک گھس کر ننگی گردن، دل کا پنچھی آزاد فضاؤں میں اُچھالنے کو ہے۔
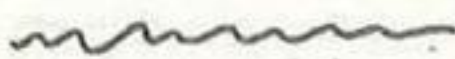
المیہ

(۱)

سب کچھ موافق تھا۔ ان کے درمیان نہ رقیب، نہ ماں باپ، نہ بہن بھائی یعنی کوئی بھی تیسرا حائل نہیں تھا۔ ایسے خوش قسمت جوڑے بھلے لاکھ ہیر رانجھا ہوں، کوئی المیہ تخلیق نہیں کر سکتے۔

(۲)

۔۔۔صحت مند جسم بیماریوں کو کیسے جنم دے سکتے ہیں۔۔۔

(۳)

آج ان دونوں کی میڈیکل رپورٹ ان کے عشق کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ کسی پنجابی فلم کے ولن کی طرح قدرت کے وحشیانہ قہقہے ان کے چار اطراف گونج رہے تھے۔ وہ المیہ تخلیق کر رہے تھے۔

ظ

سرخ چہرہ: ''آنکھوں دیکھے کی ایسی کی تیسی۔۔۔''

زرد چہرہ: ''میں نے سنا بھی ہے۔''

سرخ چہرہ: ''تیرے کانوں کی تو۔۔۔''

زرد چہرہ: ''م م مجھے کچھ کہنے کی۔۔۔''

سرخ چہرہ: ''زبان کھینچ لوں گا۔۔۔اگر ایک لفظ بھی نکلا تو۔''

میں نے زبان چپ کی گوند میں ڈال دی اور اپنا آپ اس بے رحم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

ہر نیا دن

میں نے انھیں دیکھ لیا ہے۔ وہ دونوں چھریاں پیٹھ پیچھے چھپا کر میری طرف ہی آ رہے ہیں۔ اب میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور آخری وقت میں کچھ اچھا سوچنے کی کوشش کرنے لگا ہوں۔۔۔ اچھی یادوں میں میرے پاس صرف یہی دو چہرے ہیں۔۔۔ میں خوبصورت یادوں کو سوچ رہا ہوں۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دور گالوں کے افق تک پھیلی ہوئی ہے۔۔۔ ذہن چھری کے پہلے وار کی شدت پر مرکوز ہے۔

نابینا

ر۔۔۔روشنی

پھر کہو۔

ر۔۔۔روشنی

ر۔۔۔روشنی جو تمھاری بصارت میں نہیں بصیرت میں رکھی گئی ہے۔ یہ روشنی اس اندھیرے کی متضاد ہے جو تمھارے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے۔ ماں۔۔۔ر۔۔۔کو خوب لمبا کھینچ کر کہتی، ررررر۔۔۔روشنی، تو۔۔۔ر۔۔۔کا ارتعاش، میرے اندھیروں میں شررفشانی کرنے لگتا۔

پھر ماں نے لفظ ''متضاد'' سمجھانے کے لیے جب میرے ایک گال پر آگ سے گرم کیا ہاتھ اور دوسرے پر برف سے یخ ہوا ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔۔۔ ''یہ ہوتا ہے تضاد'' ۔۔۔ اسی دن مجھ نابینا کی بصیرت میں منافقت در آئی تھی۔ اب میں منافقت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ تم نے تو روشنی اپنی ننگی آنکھوں سے دیکھ رکھی ہے۔ میں تم پر اعتماد نہیں کرسکتا۔۔۔ تم جا سکتی ہو۔

سید ماجد شاہ کی یہ کہانیاں، مختصر افسانے یا مائیکرو فکشن کسی تخفیف شدہ حقیقت یا ہنگامی صورتِ حال کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ سماج کی ایسی گم شدہ معنویت کی بازیافت ہے جس کا راست ادراک ایک تخلیق کار ہی کر سکتا ہے۔ یہ جمال پارے بقول ہیگل آپ کو یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ ''خالص وجود اور خالص عدم ایک جیسے ہیں۔'' ان کہانیوں میں آپ کا واسطہ ایک ایسے تجریدی تحیر سے پڑتا ہے جس کی تمام جہتیں کسی نہ کسی حوالے سے وجود کے ساتھ منسلک ہیں اور امکانی تعبیرات میں زندہ رہنے کی کوشش بھی ہے۔ یہ کہانی اس انسان کی بھی ہے جو انتخابی صلاحیت رکھنے کے باوجود جبر کی فضاؤں میں اپنی پس انداز قوتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

یہ جیتی جاگتی کہانیاں اپنے اُسلوب، رنگ و آہنگ، معنیاتی وسعت اور بے ساختگی کی وجہ سے متاثر کرتی ہیں۔

عامر سہیل

ایبٹ آباد
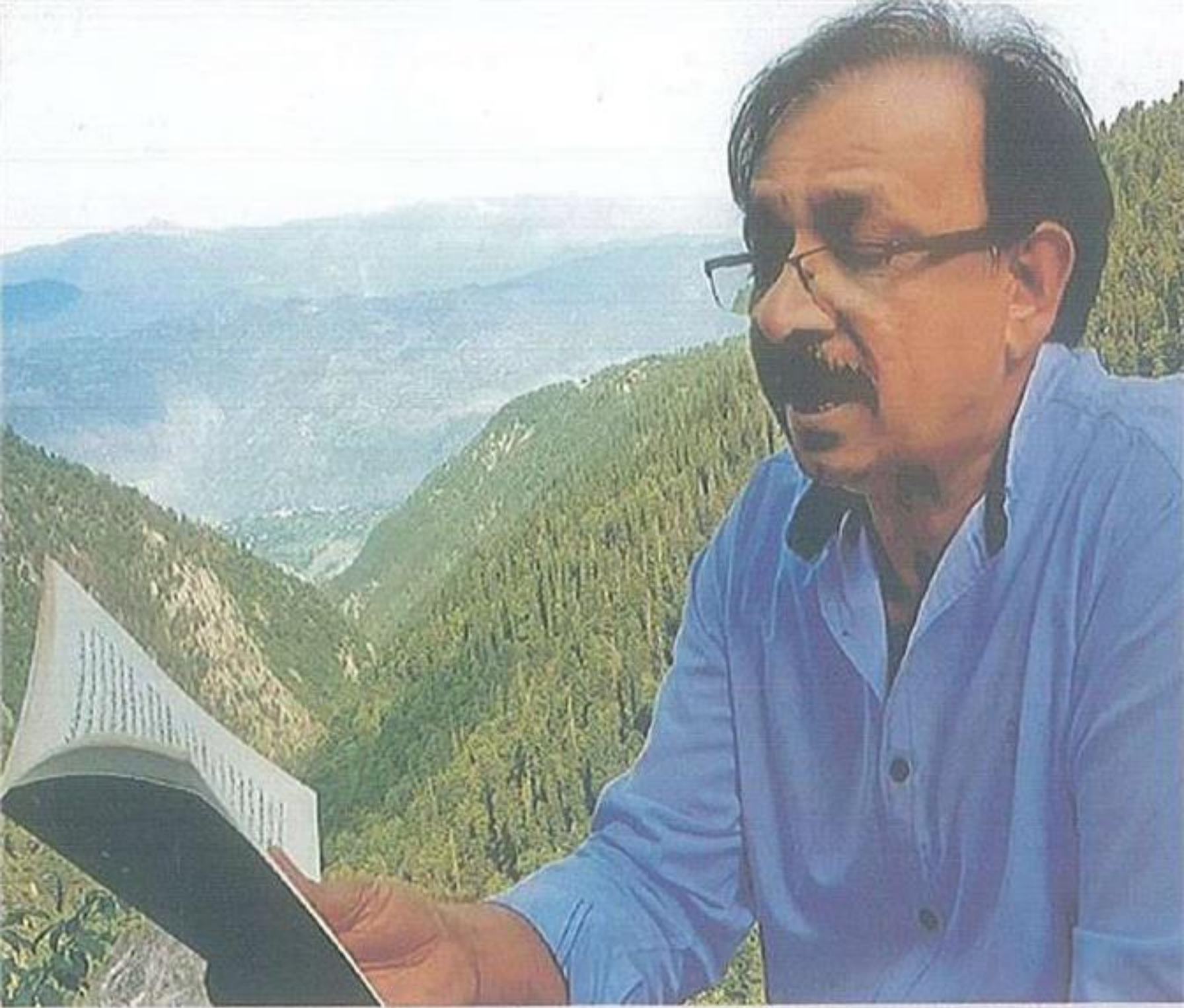
مصنّف کی کتابیں

- ق (اُردو افسانے) ۲۰۱۶ء
- درشاہی (ہندکو نظم و نثر) ۲۰۱۷ء
- اورش (ہندکو افسانے) ۲۰۱۷ء
- ر (اُردو مختصر افسانے) ۲۰۱۸ء

زیرِ طبع

- م (اُردو شاعری)
- سر بن دی چھنگ (ہندکو نظمیں)
- کہانڑی آخدی اے (ہندکو مختصر افسانے)
- منتخب ہندکو افسانے (منتخب ہندکو افسانوں کا اُردو ترجمہ)

Ph:+92-41-2643841, Cell:0300-6668284